آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2021

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद

National Council for Promotion of Urdu Language

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

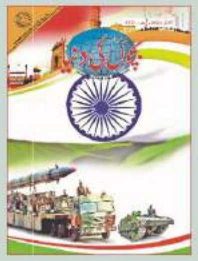

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ہاجرہ نازلی: ایک اہم ناول نگار	ڈاکٹر نوشین حسن	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	آزادی سے قبل خواتین کی ناول نگاری کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ	10
	اعجاز شاہین کے افسانوں میں عورت کے مسائل کی عکاسی	ڈاکٹر شائقہ آفرین	15
	ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی	محمد فرحان خان	18
	اردو ادب میں ماحولیاتی تانیثیت	توصیف بریلوی	23
	خواتین کے مسائل اور اخبارات	محمد اعراج تنویر صدیقی	27
	نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کا علمبردار: ڈپٹی نذیر احمد	فردوس احمد بھٹ	30
	جدید غزل اور عشق کا بدلتا تصور	شازیہ بانو	37
کہانیاں	رنگ آسماں	ڈاکٹر عشرت ناہید	41
	دائروں کے بیچ	نیلوفر پروین	47
	خوف	صاحبہ فردوس	50
حسن سخن	ڈاکٹر مسرور صغریٰ، فرحانہ نازنین		53
باورچی خانہ	اچار، چٹنی اور مربا	سلمیٰ حسین	55
صحت	ہمارا جسم اور غذا کی اہمیت	شکیل احمد	57
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 5 مئی 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

وجودزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

یہ صرف شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق انسانی تاریخ وتہذیب صدیوں سے کرتی رہی ہے کیونکہ عورت نہ ہوتی تو شاید یہ کائنات بھی وجود میں نہ آتی۔ کائنات کی تخلیق اور ارتقا کا انحصار عورت پر ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو ہر تہذیب میں ایک خاص اہمیت اور معنویت حاصل رہی ہے اور اس نسائی وجود نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کائنات کے تحرک کا سارا سرچشمہ نسائی ذات ہی ہے۔

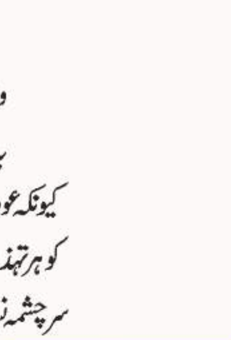

تاریخ اور تہذیب کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو عورتوں کا نہایت ہی فعال متحرک اور مثبت کردار سامنے آتا ہے۔ عورتوں نے اگر یہ کردار ادا نہ کیا ہوتا تو شاید یہ کائنات بے کیف ہوتی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ عورتوں کے متحرک اور مثبت کردار کو مرداساس معاشرے نے نظرانداز کیا جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ خواتین کمزور اور بے بس سمجھی جانے لگیں جبکہ قدرت نے عورتوں میں بہت سی توانائیاں رکھی ہیں اور حقیقت میں عورتیں توانائی کا سرچشمہ ہیں اور یہی توانائیاں معاشرے کو رنگ ونور عطا کرتی ہیں اسی لیے شاعر نے جب کہا کہ وجودزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ، تو ایک حقیقت کا اظہار کیا جس کا اعتراف سبھی کو ہے۔

ماضی میں بھی عورتوں کا مثبت اور فعال کردار تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ کیسی کیسی بلند پایہ خواتین رہی ہیں جنھوں نے علم ودانش کے باب میں اپنے امتیازی نقوش مرتسم کیے اور معاشرے کو نئی روشنی وآگہی دی ایسی خواتین کا ذکر بہت سی کتابوں میں ہے جن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جب تعلیم کی روشنی عام نہیں تھی اور اتنے وسائل اور ذرائع نہیں تھے اس کے باوجود خواتین نہ صرف بیدار تھیں بلکہ انھیں اپنے معاشرتی فرائض کا بھی پورا احساس تھا اور وہ خواتین میں علمی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہی تھیں اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئیں کہ خواتین کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آیا جس نے صرف خواتین کو ہی نہیں بلکہ مرد معاشرے کو بھی بیدار کیا ان میں سماجی اور تعلیمی شعور پیدا کیا۔ بعد کی تاریخیں بتاتی ہیں کہ عورتوں نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئیں اور آج یہ حال ہے کہ جملہ شعبہ حیات میں خواتین حسن کارکردگی کا مظاہرہ کررہی ہیں اور اپنی ذہانت اور ذکاوت سے ایک نئی تاریخ رقم کررہی ہیں۔ سائنس ہو یا ٹیکنالوجی، فلسفہ ہو یا منطق، صنعت وحرفت ہو یا تجارت کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں خواتین کسی سے کمتر ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ اب بعض شعبوں میں خواتین مردوں سے آگے بھی ہیں۔ اپنی محنت، لگن اور ارتکاز کی وجہ سے خواتین ان تمام مفروضات کو مسترد بھی کررہی ہیں جو مرداساس معاشرے نے گڑھ رکھے تھے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مردوں کا ایک بڑا طبقہ بھی عورتوں کے مسائل کے تئیں حساسیت اور بیداری کا ثبوت دے رہا ہے اور ہر محاذ پر عورتوں کی معاونت کررہا ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نوشین حسن

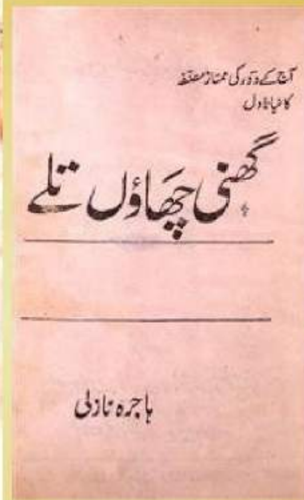

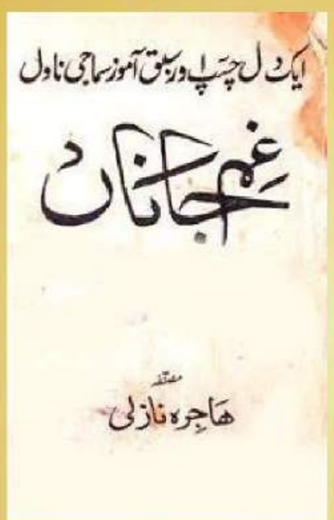

ہاجرہ نازلی

ایک اہم ناول نگار

اردو ادب کی خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہاجرہ نازلی کا بھی ہے۔ہاجرہ نازلی نے ایسے وقت میں لکھنا شروع کیا جس وقت ناول نگاری اپنے عروج پر تھی اور مختلف خواتین ناول نگاروں کی تخلیقات منظر عام پر آرہی تھیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ اہم ہیں۔ہاجرہ نازلی نے تقریباً ۱۸ ناول تحریر کیے جو شائع ہوکر منظر عام پر آتے رہے۔ان میں بیشتر ناول کافی مقبول ہوئے ۔ان بیش قیمت ناولوں میں صبیحہ، نغمہ، نئے قدم، غم دوراں، شب آرزو، شبینہ، انتظار سحر، نشاط غم، ببول کے سائے، نمود سحر، گھنی چھاؤں تلے، خوابوں کے جزیرے، ایک گھروندہ برف کا، بھیگا دامن اہم ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے کئی افسانے بھی لکھے جس کی وجہ سے انھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان میں دلہا بکتا ہے، قہقہہ، ایک مکالمہ، دس ضرب دس اور بس، پرکھ، خواہشیں فریب ہیں، سمٹتی دھوپ، بوڑھے منہ مہاسے، سودا، پیار کی پیاس، مایا جال وغیرہ ممتاز افسانے ہیں۔

ہاجرہ نازلی کی پیدائش (1920) میں اترپردیش کے مشہور شہر دیوبند میں ہوئی اور انتقال (2004) میں علی گڑھ میں 84 سال کی عمر میں ہوا۔ہاجرہ نازلی ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ۔ان کے پردادا امام قاسم نانوتوی (1880) بانی دارالعلوم دیوبند تھے۔والد مولانا قاری محمد طیب قاسمی دیوبندی تھے جن کا شمار ہندوستان کے جید علما میں کیا جاتا ہے۔ہاجرہ نازلی کی شادی بھی ایک ایسے ہی معزز خاندان میں جناب مولانا حامد الانصاری غازی سے ہوئی جو ہندوستان کے سنجیدہ عالم دین، مصنف، مشہور صحافی اور برطانوی استعمار کے خلاف سینہ سپر ہونے والے مجاہد تھے۔حامد الانصاری بھی بیک وقت ایک شاعر، مصنف، مترجم اور صحافی تھے جنھوں نے اپنی بیش قیمت تحریروں سے ملک وقوم کی خدمت کی۔ یہ ہاجرہ نازلی کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا میکہ اور سسرال ایسا ملا جس سے ان کے ادبی شوق کو اور بھی وسعت ملی حالاں کہ ہاجرہ نازلی نے باضابطہ کسی اسکول اور کالج سے ڈگری حاصل نہیں کی تھی لیکن انھوں نے گھر پر رہ کر ہی اتنی تعلیم حاصل کرلی تھی کہ اپنے ادبی شوق کو جلا دے سکیں۔ بقول سلمان غازی۔عورتوں کی باقاعدہ تعلیم کا اس وقت تک بھی کوئی چلن نہیں تھا جس کی امی ہمیشہ شاکی رہیں لیکن گھر میں ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ادبی مجلسیں، گفتگو بھی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہاجرہ نازلی میں بیک وقت کئی خوبیاں

جمع ہوگئی تھیں۔ وہ ناول نگار، افسانہ نگار اور کامیاب مصنفہ کے طور پر منظرِ عام پر آئیں۔ ان کا مطالعہ کائنات کافی وسیع تھا۔ جزئیات نگاری پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی سماجی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں پر نظر رکھتی تھیں۔ انسانی نفسیات پر انھیں مکمل دسترس تھی نیز یہ وہی خوبیاں ہیں جو ان کی تخلیقات میں اتر آئی ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم سے ایسی تحریروں کی آبیاری کی جو اپنی مثال آپ ہیں نیز ہاجرہ نازلی نے ادب کی ترقی اور اس کی وسعت کے لیے تقریباً اپنی زندگی کا تین چوتھائی حصہ صرف کیا۔

ہاجرہ نازلی بڑی ہی سنجیدہ شخصیت کی مالک تھیں۔ سماج کی بنتی اور مٹتی قدروں پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اپنے ناولوں میں کہیں متوسط گھرانوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں پر نکتہ رسی کرتی ہیں کہیں اپنے دیگر ناولوں میں اعلیٰ گھرانوں میں پیدا ہونے والی تہذیب پر خامہ فرسائی کرتی ہیں۔ وہ اسلوب کی روانی اور ندرت بیانی سے ایسے عمیق اور اہم پہلوؤں کی کی نقاب کشائی کرتی ہیں جو قابلِ ذکر ہونے کے ساتھ قابلِ فکر بھی ہیں۔ ان کے سبھی ناول فنی نقطۂ نظر پر پورے اترتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک ناول 'انتظارِ سحر' ہے۔ یہ ایک ایسا تخلیق پارہ ہے جو نایاب ہی نہیں بلکہ کمیاب ہے۔

'انتظارِ سحر' کے لغوی معنی ایک ایسی صبح کا انتظار کرنے کے ہیں جو خوشیوں اور امیدوں سے بھری ہو۔ دراصل یہ عنوان دو مرکب الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ناول نگار نے کافی غور و فکر کے ساتھ اپنے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بھی کافی مضبوط ہے، جس میں کسی بھی قسم کا جھول نہیں پایا جاتا ہے بلکہ ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار 'منصور' ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ نئی تہذیب کا دلدادہ ہے۔ ناول نگار نے منصور نام کا انتخاب کافی سوجھ بوجھ کے ساتھ کیا ہے۔ شیما اس ناول کی ہیروئن ہے۔ یہ حسن و جمال کا پیکر ہے اور یہ زمانے کی باتوں کی پرواہ کرنے والی ایک غیرت مند کردار ہے۔ اس کے لیے عزت و وقار سب سے مقدم ہے۔ وجاہت علی منصور کے والد ہیں جو اپنی قدیم روایات کے دلدادہ ہیں۔ چمن آرا اور جہاں آرا منصور کی پھوپھیاں ہیں جو طلاق یافتہ ہیں اور میکہ پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔ محل میں صرف ان کی ہی حکمرانی چلتی ہے جب کہ جہاں بانو بہو ہوتے ہوئے بھی محل سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکی تھیں کیوں کہ انھوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے 'حق مہر' کا مطالبہ کرلیا تھا جو محل کی روایات کے خلاف تھا بلکہ یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کی پاداش میں انھیں اپنا گھر بلکہ اپنے بچوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اطہر، ثریا اور گوہر اس ناول کے ضمنی کردار ہوتے ہوئے بھی اہم ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ منصور وہ تعلیم یافتہ نوجوان ہے جس کی جدید فکر قدیم فکر سے ٹکراتی ہے تو محل میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ مختصراً کہانی کچھ یوں ہے۔ منصور انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے دس سال بعد اپنے گھر واپس آتا ہے۔ یہ نئی تہذیب کا گرویدہ ہے جب کہ محل میں تمام فرسودہ روایت کا چلن تھا جس سے وہ چند روز میں ہی اکتا جاتا ہے اور وہاں کے رسم و رواج کو ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ ولایت سے آنے کے بعد اپنی چچی کو (اس کے چچا کی بیوا) جو اسے اپنی ماں جیسی عزیز تھیں اور جن کو زمانہ پہلے محل سے نکالا جاچکا تھا۔ منصور انھیں محل لے آتا ہے جو اس کی پھوپھیوں کے حکم کی ایک ایسی خلاف ورزی تھی جس کے عوض منصور کو محل کے مکینوں کی سخت ناراضگی اور طعن و تشنہ کو جھیلنا پڑا۔ نیز منصور کے ایک اور جرأت آزما قدم نے بھی محل کے سبھی لوگوں کو برہم کردیا ساتھ ہی وہ ایک ایسی لڑکی (شیما) کے عشق میں گرفتار ہوگیا جو اس کی بیوہ چچی جہاں بانو کی بھتیجی تھی اور اس طرح محل چمن آرا اور جہاں آرا کی سازشوں کا اڈا بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شیما پر بدچلنی کا الزام لگادیا جاتا ہے۔ منصور اور شیما میں

جدائی پیدا کردی جاتی ہے جس کی وجہ سے منصور اپنا ہوش کھو بیٹھتا ہے اور اس طرح کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

ہاجرہ نازلی نے اس ناول میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے سماج کے ایسے طبقے کی بود و باش پر گرفت کی ہے جو ان کی تحریر سے پیشتر کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔قدیم اور جدید تہذیب کی کش مکش اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ناول نگار اپنے کاریِ اسلوب سے ان رسم و رواج پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں جس کی زد میں آکر انسانی زندگی بری طرح سے پامال ہوجاتی ہے۔ناول نگار جگہ جگہ ایسے جملے کوٹ کرتی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان خود ساختہ رسم و رواج کو قانون کا درجہ دیتا ہے اور پھر تا حیات اس کی نگہبانی کرتا ہے:

>''چمن آرا ٹھیک کہتی ہیں۔مجھے بھی یہی ڈر ہے یہ 'قصر دلکشا' کے چپے چپے پر بڑوں کی عزت وعظمت کے گہرے نقش ثبت ہیں جس کے کونے کونے سے بزرگوں کی آوازوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہیں یہ محل ہماری عظمت رفتہ کی ایک یادگار ہی نہ رہ جائے، جس کو دیکھ کر ہم اس زریں دور کی مٹی مٹی سی پرچھائیاں تلاش کرتے رہ جائیں۔''

(انتظار سحر، ہاجرہ نازلی، ص:5،6)

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے محل میں رہنے والے ان مکینوں کی فکر کو پیش کیا ہے کہ ان کو ڈر ہے کہ کہیں نئے زمانے کا منصور ان کی روایت شکنی نہ کر ڈالے کیوں کہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ منصور زیادہ تعلیم یافتہ ہے نیز ان کا یہ خدشہ درست بھی ثابت ہوتا ہے۔منصور ولایت سے آنے کے بعد محل کی رسومات کو ماننے سے انکار کرتا ہے جو نہایت فرسودہ تھیں۔اس میں سے ایک صدقہ و خیرات اور توہم پرستی ہے جس کا محل میں خوب رواج تھا۔مثلاً کالے ڈھاگے باندھنا، سر پر سے تیل کو اتارنا، زندہ بکرا کو سر کے اوپر سے پھیر کر اتارا کرنا وغیرہ۔اس تعلق سے بطور نمونہ ایک اقتباس پیش ہے:

>''وہ اس کو (منصور کو) لیے ہوئے کمرے میں آئے اندر آکر پہلے نواب صاحب نے صدقہ اتارا غریبوں میں تقسیم کیا پھر باری باری سب نے حسب حیثیت صدقہ اتار کر بانٹا۔۔ سب سے پہلے چمن آرا نے بلائیں لیں پھر اس پر تیل اور مالش کا صدقہ کیا بہنوں نے روپے پھیر کر غریبوں کو دیے۔۔ اطہر نے آتے ہی بکرے کو سر سے اونچا کر کے منصور کے اوپر سے گھمانا شروع کیا۔'' (ایضاً۔ص:17)

ناول نگار یہاں پر طنز کے تیر چلاتی ہیں اور ان بے ہودہ رسومات پر نکتہ چینی کرتی نظر آتی ہیں دراصل طنز کی ماہیت توسیفی ہے۔اس کا استعمال ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے وہ خواہ نثر ہو یا شاعری۔طنز نے ادب میں لوہا منوایا ہے۔یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو کائنات میں پائی جانے والی ہر ناہمواری پر کیا جاسکتا ہے۔نیز ہاجرہ نازلی نے بھی طنز کا استعمال خوب کیا ہے جو مزاح کے حسین و دبیز پیرائے میں موجود ہے۔ناول نگار سماج میں پائی جانے والی ان بدعقیدگی پر گرہ لگاتی ہیں جس کو جبراً عمل میں لانا مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔البتہ ہاجرہ نازلی نازک اور لطیف جملوں کی مدد سے اپنی بات بڑی آسانی سے کہہ گئی ہیں کہ قاری کو گراں بھی نہ گزرے اور ان کی بات بھی خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچ جائے۔

>''ہائے کیا زمانا تھا کیسے کیسے مخلص اور اخلاق و مورت کے پتلے لوگ تھے جو ذرا ذرا سی بات پر محض آن کی خاطر گھر لٹا دیتے تھے۔۔اس زمانے میں وہ باتیں ڈھونڈنے میں نہیں ملتیں۔۔بخدا آج وہ مسخروں کو وہ کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی زندگی، وہ بے فکریاں اور اخلاص و محبت اور خیر و برکتیں میسر ہی کب ہیں۔'' (ایضاً۔ص:14)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہاجرہ نازلی نے اُس سماج پر زبردست چوٹ کی ہے جس کے پروردہ کو نہ آج کی فکر تھی اور نہ آنے والے زمانے کا کوئی غم تھا۔وہ سبھی مال و دولت کے نشے میں چور اور مست اپنی زندگی گزار رہے تھے۔نیز ناول نگار نے اس کہانی کا تانا بانا بڑے ہی موثر اور خوبصورت انداز کے ساتھ بنا ہے۔ابتدا سے لے کر اختتام تک کہانی میں تسلسل کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔مکالمہ نگاری اس قدر خوبصورت اور لطیف ہے کہ ہر لفظ اور جملے سے شگفتگی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ناول نگار نے سادگی و سلاست اور روانی کے ساتھ شرفا کی بود و باش اور بوسیدہ و منجمد فکر کو پیش کیا ہے۔ضرب الامثال کو کچھ اس طور برتا ہے کہ مکالموں میں حسن پیدا ہوگیا ہے مثلاً۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، مرغے کی ایک ہی ٹانگ، دیدہ ہوائی ہونا، کچی گولیاں کھیلنا، کڑوا کریلا نیم چڑھا، بات کا بتنگڑ بنانا، گونگے کا گڑھ کھانا وغیرہ۔اس کے ساتھ ہاجرہ نازلی نے بیگماتی زبان و بیان کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں ادا کیا ہے جس سے ناول میں خاص قسم کی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔چوں کہ بیگمات کا طرز اظہار مختلف قسم کا ہوا کرتا تھا جو اِس موڈرن ایج میں ختم ہوچکا ہے۔ناول نگار نے اپنے اس ناول میں خواتین کے اس مخصوص طرز اظہار سے جاذبیت پیدا کردی ہے جو بہت ہی دلچسپ اور عمدہ ہے، جس کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

''اے بیوی اس لڑکی کا دیدہ ہوائی ہوگیا۔ (ایضاً۔ص:7)

'' چل بڑا آیا جھوٹا لپاٹی۔نادرہ نے ایک تھپڑ لگا کر رکھا۔''

(ایضاً۔ص:9)

''اے بیٹا کہاں گھسٹتا چلا آرہا ہے اٹھ کر بیٹھ جا۔چمن آرا نے اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔'' (ایضاً۔ص:3)

''بک جھک کر بیٹھ گئی۔'' (ایضاً۔ص:10)

''اس زمانے کی تو لڑکیاں علامہ دہر بن گئی ہیں اتنی تیز گام ہیں کہ ہم جیسے تو گرد راہ میں ہی گم ہوگئے۔'' (ایضاً۔ص:13)

''اس کو کوئی لگاؤ اور محبت ہے نہیں ،اسی ماں کے کوڑی پھیرا کرتا ہے جن نے کبھی انگلی لگائی نہ شور باچٹایا۔'' (ایضاً۔ص:9)

''کام وام کچھ نہیں ہوگا، دن بھر جلے پیر کی بلی کی طرح یونہی پھرتا ہے۔'' (ایضاً۔ص:9)

اسی طرح ناول نگار نے منظر کشی کے بیان میں بھی اپنے فکر وفن کے دریا بہائے ہیں۔نیز ناول نگار اس بات سے بخوبی واقفیت رکھتی ہیں کہ منظر کشی کسی بھی تخلیق کو زندگی بخشنے کا رول ادا کرتی ہے۔اس کا خیال رکھتے ہوئے وہ ہر منظر کی عکاسی بڑے نایاب طریقے سے کھینچتی ہیں۔اسی طرح جب محل کی آرائش کا ذکر کرتی ہیں تو اس کی ہر چیز نفاست اور خوبصورتی کا پیکر نظر آتی ہے۔مثلاً:

''محل کے بڑے بڑے وسیع اور دبدبہ خیز حال لمبی لمبی گیلریاں جن میں کہیں قیمتی قالین، زرنگار تکیے۔۔منقش مسندیں اور کہیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں گویا آنے والے کے لیے سب کچھ فرش راہ تھا۔سامنے کے مستطیل لان میں سنگ مرمر کا فوارہ اپنا معطر پانی مہمان پر نچھاور کرنے کے لیے بے چین تھا کمروں کے نازک دروازے خوبصورت حریری پردوں کے گھونگھٹ نکالے آغوش شوق کھولے ہوئے منتظر تھے۔'' (ایضاً۔ص:16)

فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ناول کو برقرار رکھنے والی خصوصیت اختصار اور جامعیت ہے ۔ناول نگار کو مختصر اور جامع انداز بیان پر جتنی قدرت ہوگی تحریر اتنی ہی دلکش معلوم ہوگی۔ایک ممتاز ناول نگار اپنی محاسبانہ اور محاکمانہ خوبیوں کی بدولت ایسے فن پاروں کی تخلیق کرتا ہے جس کا براہ راست اثر قاری پر پڑتا ہے۔اسی طرح خاکہ نگاری بھی ایک کامیاب ناول کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے۔اس سے واقعات اور بھی سچے اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ناول میں خاکہ نگاری کے نقوش شعوری طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں ۔اس کے لیے ناول نگار اپنی تحریر میں ایک ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے عبارت زیادہ زندہ اور متحرک معلوم ہوتی ہے۔ہاجرہ نازلی نے بڑی ہی عمدگی کے ساتھ اس خوبی کو برتا ہے۔بطور نمونہ ایک اقتباس پیش ہے:

''جیسے ہی گاڑی پلیٹ فارم پر رکی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے ایک نوجوان پلیٹ فارم پر کود گیا بلند وبالا قد بھرا ابھرا ڈیل چوڑا چکلہ سینہ کھلا ہوا گندمی شفاف رنگ بڑی بڑی ذہین آنکھیں اونچی پیشانی جس پر گھونگھر والے بالوں کی ایک لٹ لہرا رہی تھی، گہرے سلیٹی رنگ کے گرم سوٹ پر سرخ لہریے والی ٹائی بندھی ہوئی تھی۔ یہی نواب زادہ منصور علی نواب وجاہت علی کا اکلوتا بیٹا تھا جو دس سال بعد ولایت سے واپس آیا تھا۔'' (ایضاً۔ص16)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہاجرہ نازلی نے خاکہ نگاری کی ایک مکمل اور دلکش تصویر پیش کی ہے۔دارصل خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو مشکل ہونے کے ساتھ حد درجہ دلچسپ بھی ہے۔اس کے اپنے اصول اور ضابطے ہوتے ہیں جس کا ناول نگار نے خاص خیال رکھا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہاجرہ نازلی نے اس ناول میں ذہنی طور سے پچھڑے ان اعلیٰ گھرانوں پر نکتہ رسی کی ہے جن کے یہاں انسان اور اس کی آزادی سے زیادہ ،اس کے اپنے وہ رسم و رواج پر مبنی قانون ہوتے ہیں جس کی حفاظت کے لیے وہ اپنے ہی لوگوں کی زندگی کو صفِ ماتم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں۔دراصل اس ناول کے ذریعہ ناول نگار نے سماج کے فرسودہ رسم ورواج پر چوٹ کی ہے جو جھوٹی روایات کی شکل میں کہیں نہ کہیں آج بھی موجود ہے۔جس سے لوگوں کی زندگی بہت متاثر ہوتی ہے ایسے ہی جیسے اس ناول کے ہیرو منصور کے ساتھ ہوا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔نیز ہاجرہ نازلی ایک بہترین تخلیق کار کی طرح فن کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک عمدہ ناول کو منظر عام پر لائیں جس کی اپنی نظیر ہے۔

□□□

Dr. Nausheen Hassan
Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

شاعرات کے منتخب اشعار

چلے تھے جانب منزل تو کس نے سوچا تھا
وہاں ملیں گے نہ تنکے بھی آشیاں کے لیے

نظر اسیر صنم ہے جبیں رہین حرم
یہی ہے شیوۂ ایماں تو کافری کیا ہے

وحیدہ نسیم

جلنے لگے چراغ ترے غم کے شام سے
شام فراق آئی بڑے اہتمام سے

زباں کھلی نہ نگاہیں ملیں نہ بات ہوئی
عجیب رنگ میں شرح غم حیات ہوئی

ممتاز مرزا

نہ راہ میں کوئی شجر نہ اب کوئی سراب ہے
نہ آرزو کے سلسلے، نہ ریگ زارِ خواب ہے

ہے موج موج میں پیچاں مری انا کا ثبات
کہ بحرِ غم نے اچھالا ہے بار بار مجھے

زاہدہ زیدی

مرے وجود پر وہ بن کے اوس کیا برسا
زمیں سے آنے لگی مجھ کو آسماں کی مہک

سر پہ اٹھا کے بارِ مصائب چلیں عیاں
دیکھیں ہمارے چاہنے والے کدھر گئے

رشیدہ عیاں

غم دوراں کو غم دل کا مداوا سمجھا
اس خرابے میں بسا رکھی ہے دنیا ہم نے

طلسم زندگی کیا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جدھر اٹھے نظر حیرانیاں معلوم ہوتی ہیں

سیدہ فرحت

وہ صبح آئے کہ پھر جس کی کوئی شام نہ ہو
جو میرا خواب ترے خواب سے بدل جائے

نظر نظر مہ و انجم، نفس نفس خوشبو
ترے خیال کی بستی عجیب بستی ہے

جمیلہ بانو

اشکوں کی ہر اک رسم نبھانے کے لیے ہم
صندل کے کٹوروں میں انھیں گھول رہے تھے

اک بیل چنبیلی کی منڈوے پہ چڑھانا تھی
اور فصل گزشتہ کی تقریب منانا تھی

صغریٰ عالم

ہماری جاگتی آنکھوں میں خواب کیسا تھا
گھنیری شب میں اگا آفتاب کیسا تھا

تمام جسم میں ہوتی ہیں لرزشیں کیا کیا
سوادِ جام میں یہ بجتا رباب کیسا تھا

بلقیس ظفیر الحسن

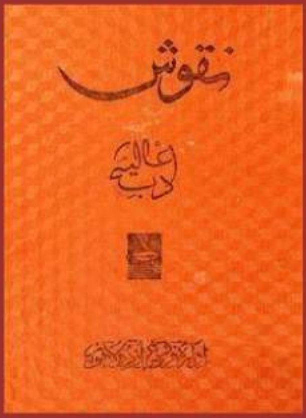

ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ

آزادی سے قبل خواتین کی ناول نگاری کا اجمالی جائزہ

خواتین میں فنون لطیفہ سے لگاؤ اور ادبی میدان میں طبع آزمائی کا ذوق عہد قدیم ہی سے رہا ہے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

"طلوع اسلام کی اولین صدی میں بھی مسلمان عورتوں نے مدینہ، قاہرہ، غرناطہ بغداد اور دمشق میں علم و ادب کے چراغ روشن کیے تھے۔ دور عباسیہ میں بغداد کی عورتیں ادبی مذاکروں اور موسیقی کی مجلسوں کی نہ صرف صدر نشین ہوتیں بلکہ ان میں سرگرمی سے حصہ بھی لیتی تھیں۔ ماہر قانون خواتین بھی موجود تھیں۔ عباسی شہزادیاں غیر ملکی صفیروں کو باریاب کرتیں اور مملکت میں شریک رہتیں اور بغداد کی یونیورسٹیوں میں ادب و تاریخ پر درس دیتیں تھیں"

(قرۃ العین حیدر۔ "نقوش ادب عالیہ" جولائی 1960، لاہور، ص 29)

اٹھارہویں صدی کے نصف اول 1720 ہی سے یوروپ کی خواتین میں آزادیٔ نسواں تحریک کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اس دور میں پہلی مرتبہ چند پڑھی لکھی خواتین نے ایک محفل بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ گپ بازی کے بجائے خواتین علمی و ادبی گفتگو کرنے کی عادت ڈالیں۔ اس محفل کا نام "بلو اسٹوکنگ حلقہ" تھا۔ (Blue Stockings Society) ہندوستان میں خواتین نے اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی سے ادبی میدان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ 1857 کے بعد سے ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں عروج پانے لگیں جس کے سبب انھوں نے اپنا بیش بہا علمی و ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک بھی فرسودہ سماج نے خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا یہ وہ دور تھا جب عورت کے لیے ناول پڑھنا اور ذوق شعر فہمی کو ممنوع قرار دیا گیا تھا اور کہا جاتا تھا کہ ناول پڑھنا اور شاعری کرنا طوائفوں کا کام ہے۔

انیسویں صدی ہی سے خواتین کی ناول نگاری کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن اس دور کی خواتین سماج اور افراد خاندان کے ڈر سے فرضی ناموں سے

اپنی تخلیقات شائع کرواتی تھیں ۔ بیسویں صدی میں خواتین میں بیداریٔ شعور کا جذبہ جیسے ہی شدت اختیار کرنے لگا تو وہ بے باک ہوکر حقیقی ناموں کے ساتھ اپنی تخلیقات شائع کروانے لگیں جس میں سماجی بے انصافیوں، ظلم وجبر، تشدد، عدم مساوات، استحصال، بچپن کی شادی، غلط تربیت وغیرہ جیسے مسائل پر کھلے عام لکھنے لگیں۔

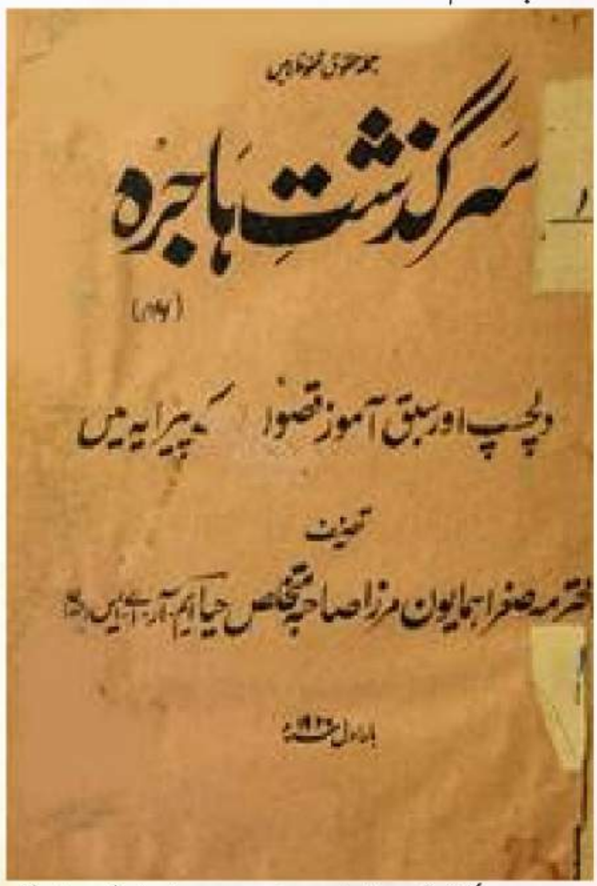

ابتدائی خواتین ناول نگاروں میں حسب ذیل خواتین قابل ذکر ہیں۔ پہلی خاتون ناول نگار رشید النساء نے ناول ''اصلاح النساء'' سے طبقۂ نسواں کو عملی اور اخلاقی جوہر سے مالا مال کیا۔ محمدی بیگم نے (صفیہ بیگم آجکل اور شریف بیٹی) ناول لکھے۔ اکبری بیگم کے چار ناولوں کا پتہ چلتا ہے (گلدستہ، عفت نسواں، شعلہ پنہاں اور گودڑ کا لعل)۔ نذر سجاد حیدر کے ناول (اختر النساء بیگم، جانباز، آہ مظلوماں، ثریا، نجمہ، حرماں نصیب) دستیاب ہیں۔ طیبہ بیگم نے ناول (انوری بیگم) سے خود کو متعارف کیا۔ ب سدید نے (بیاض سحر) ناول یادگار چھوڑا۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے (سر گزشت ہاجرہ اور مشیر نسواں) سے سرمایۂ ادب میں اضافہ کیا۔ ا۔ض حسن نے (روشنک بیگم) ضیا بانو نے (فغان اشرف، فریب زندگی، انجام زندگی) ناول قلم بند کیے۔ حمیدہ سلطان مخفی نے (ثروت آرا بیگم) ناول تحریر کیا۔ بیگم شاہ نواز کا (حسن آرا) اور عباسی بیگم کا ناول (زہرہ بیگم) ہمدست ہو چکے ہیں ۔

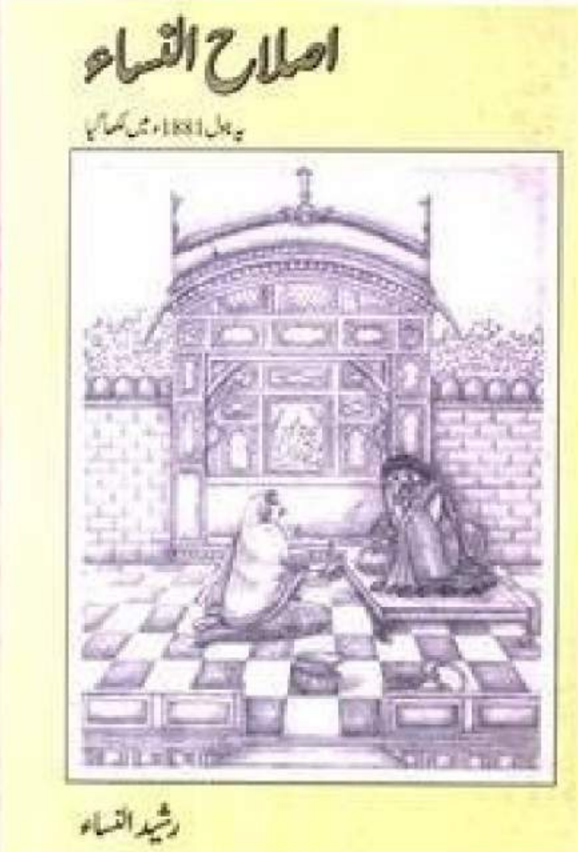

تحقیق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ''رشید النساء کو اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے، انھوں نے 1881 میں ناول ''اصلاح النساء'' لکھا، سید قیصر امام اس ناول کے دیباچہ سوم میں لکھتے ہیں کہ یہ ناول پہلی بار 1894 میں شائع ہوا۔ ان کے فرزند محمد سلیمان نے 13 برس بعد اس ناول کو 1994 میں شائع کیا۔ اس ناول کے ابتدائی ایڈیشن میں بھی مصنفہ کا نام گوشۂ گمنامی میں رکھ کر والدہ محمد سلیمان کے نام کے ساتھ شائع کیا گیا اور 2000ء میں مصنفہ کے اصل نام کے ساتھ دوبارہ اشاعت عمل میں لائی گئی۔ اس ناول میں توہم پرستی ، بے جا رسومات، گھریلو نا چاقیوں اور لڑکیوں کی خصوصی تربیت پر زور دیا گیا۔ مصنفہ مقدمے میں لکھتی ہیں کہ جب ہم خیالوں نے فرمائش کی کہ یہ تمام باتیں نصیحتوں کے طور پر لکھ دیں۔ نصیحت کے طور پر لکھنا مناسب نہ سمجھا اور تمام حقائق کو قصے کے پیرائے میں لکھ دیا۔ ''اصلاح النساء'' ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کے طرز پر لکھا گیا اس ناول کا مقصد ہندوستانی خواتین و لڑکیوں کی ذہنی آبیاری، مذہبی تربیت، سماجی اصلاح خاص طور پر

اپنی تخلیقات شائع کرواتی تھیں ۔ بیسویں صدی میں خواتین میں بیداریٔ شعور کا جذبہ جیسے ہی شدت اختیار کرنے لگا تو وہ بے باک ہو کر حقیقی ناموں کے ساتھ اپنی تخلیقات شائع کروانے لگیں جس میں سماجی بے انصافیوں، ظلم و جبر، تشدد، عدم مساوات، استحصال، بچپن کی شادی، غلط تربیت وغیرہ جیسے مسائل پر کھلے عام لکھنے لگیں۔

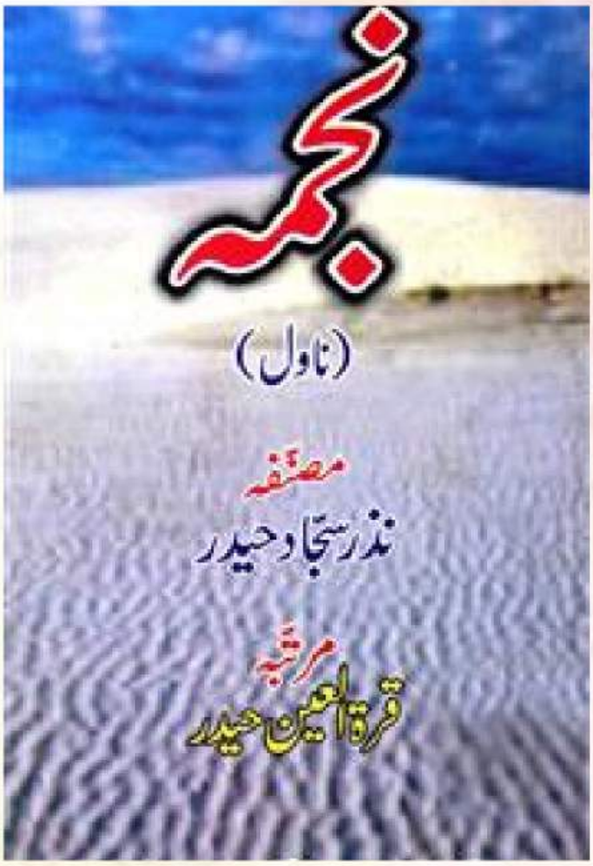

ابتدائی خواتین ناول نگاروں میں حسب ذیل خواتین قابل ذکر ہیں۔ پہلی خاتون ناول نگار رشید النساء نے ناول ''اصلاح النساء'' سے طبقۂ نسواں کو عملی اور اخلاقی جوہر سے مالامال کیا۔ محمدی بیگم نے (صفیہ بیگم آجکل اور شریف بیٹی) ناول لکھے۔ اکبری بیگم کے چار ناولوں کا پتہ چلتا ہے (گلدستہ، عفت نسواں، شعلہ پنہاں اور گودڑ کا لعل)۔ نذر سجاد حیدر کے ناول (اختر النساء بیگم، جانباز، آہ مظلوماں، ثریا، نجمہ، حرماں نصیب) دستیاب ہیں۔ طیبہ بیگم نے ناول (انوری بیگم) سے خود کو متعارف کیا۔ ب سدید نے (بیاض سحر) ناول یادگار چھوڑا۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے (سر گزشت ہاجرہ اور مشیر نسواں) سے سرمایۂ ادب میں اضافہ کیا۔ ا۔ض حسن نے (روشنک بیگم) ضیا بانو نے (فغان اشرف، فریب زندگی، انجام زندگی) ناول قلم بند کیے۔ حمیدہ سلطان مخفی نے (ثروت آرا بیگم) ناول تحریر کیا۔ بیگم شاہ نواز کا (حسن آرا) اور عباسی بیگم کا ناول (زہرہ بیگم) ہمدست ہو چکے ہیں ۔

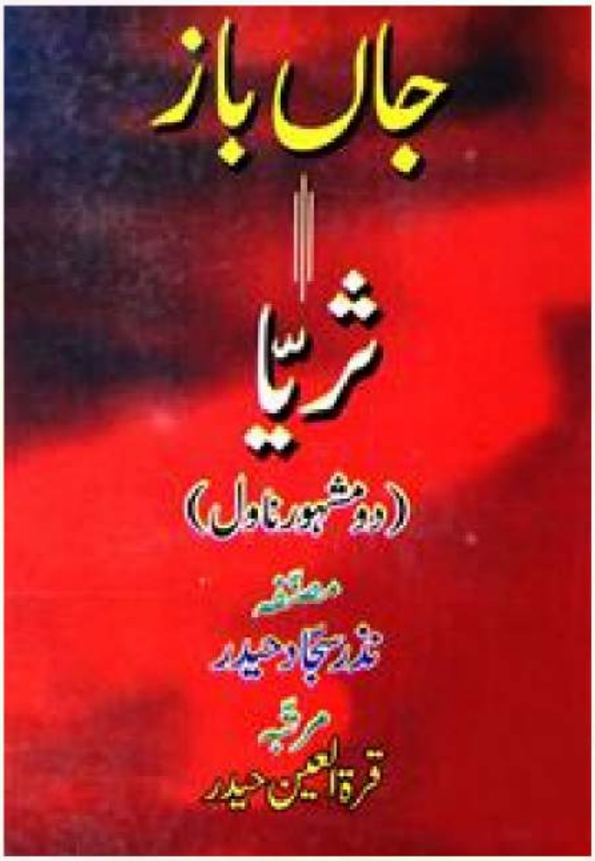

تحقیق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ '' رشید النساء کو اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے، انھوں نے 1881 میں ناول ''اصلاح النساء'' لکھا، سید قیصر امام اس ناول کے دیباچہ سوم میں لکھتے ہیں کہ یہ ناول پہلی بار 1894 میں شائع ہوا۔ ان کے فرزند محمد سلیمان نے 13 برس بعد اس ناول کو 1994 میں شائع کیا۔ اس ناول کے ابتدائی اڈیشن میں بھی مصنفہ کا نام گوشۂ گمنامی میں رکھ کر والدہ محمد سلیمان کے نام کے ساتھ شائع کیا گیا اور 2000ء میں مصنفہ کے اصل نام کے ساتھ دوبارہ اشاعت عمل میں لائی گئی۔ اس ناول میں توہم پرستی، بے جا رسومات، گھریلو نا چاقیوں اور لڑکیوں کی خصوصی تربیت پر زور دیا گیا۔ مصنفہ مقدمے میں لکھتی ہیں کہ جب ہم خیالوں نے فرمائش کی کہ یہ تمام باتیں نصیحتوں کے طور پر لکھ دیں۔ نصیحت کے طور پر لکھنا مناسب نہ سمجھا اور تمام حقائق کو قصے کے پیرائے میں لکھ دیا۔'' اصلاح النساء'' ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیر کے طرز پر لکھا گیا اس ناول کا مقصد ہندوستانی خواتین و لڑکیوں کی ذہنی آبیاری، مذہبی تربیت، سماجی اصلاح خاص طور پر

قرۃ العین حیدر نے ''ہوائے چمن میں خیمۂ گل'' کے عنوان سے نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا کلیات مرتب کیا۔ اس کلیات پر 47 صفحات پر مشتمل دیباچہ لکھا۔ اس دیباچے میں صفحہ نمبر 7 سے 21 تک عہد قدیم سے لے کر نذر سجاد کے عہد تک کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر مسلم معاشرے کی گمراہی اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس کے بعد 1857 کی تحریکوں وغیرہ پر خامہ فرسائی کی گئی، آگے انگریزی عہد کے متعلق لکھا گیا۔ صفحہ نمبر 37 کے اواخر سے صفحہ نمبر 54 تک مصنفہ کے متعلق لکھا جس میں صرف ناول ''اختر النساء اور ثریا'' کی تاریخ اشاعت کے ساتھ ان ہی دو ناولوں کے پلاٹ پر اظہار خیال کیا گیا۔ انھوں نے دیباچے میں طوالت سے کام لیا ہے۔ اگر وہ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتی ہوئیں صرف ناولوں ہی پر توجہ مرکوز کرتیں تو ایک تشفی بخش تحقیقی کام سامنے آتا یہیں آ کر تحقیقی نقطۂ نظر اور قوت تخلیق گویا بحیثیت محقق اور بحیثیت تخلیق کار فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

ناول اختر النساء بیگم نذر سجاد کا پہلا ناول ہے جو مسلم معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، یہ ناول رسالہ تہذیب نسواں میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا تھا جسے 1911 میں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار اختر النساء ہے جو پدرانہ سماج کی بالادستی اور مردوں کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے اور فتح یاب ہوتی ہے۔ اختر النساء کے والد دوسری شادی کر لیتے ہیں جس کے سبب اختر پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جب اسے اپنے گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ فرضی نام سے اپنی پہچان بناتی ہے۔ اپنی محنت ومشقت اور لگن سے سماج اور دنیا میں اپنی حیثیت منواتی ہے۔

ناول ''جاں باز'' سیاسی حالات پر مبنی ہے۔ اس ناول کا موضوع وطن پرستی ہے، ناول کا کچھ حصہ اخبار ''ہند'' میں شائع ہوتا رہا جب اخبار ہند بند ہو گیا تو ناول کی قسط وار اشاعت بھی رک گئی اور 14 برس بعد رازق الخیری صاحب کی فرمائش پر مصنفہ نے ناول مکمل کیا۔ ناول ''جاں باز'' کی پہلی بار اشاعت 1935 میں عمل آئی۔

ناول ثریا کی ہیروئن اینگلو انڈین گورنس کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ناول 1930ء میں شائع کیا گیا۔ اس ناول میں قدم قدم پر تعلیم کا پرچار عام کیا گیا۔ نذر سجاد نے ہندو مسلم شادی کے موضوع پر ''مذہب اور عشق'' کے عنوان سے ایک اور ناول لکھا جو 1935ء میں منظر عام پر آیا۔

ناول نجمہ کی اشاعت 1942 میں عمل میں آئی یہ ناول مشرقی اقدار اور مغربی تعلیم کے پس منظر میں لکھا گیا، مصنفہ نے دونوں میں توازن برقرار رکھتے ہوئے ایک مثالی اور صحت مند سماج کو پیش کیا ہے۔

ناول ''آہ مظلوماں'' 1914 میں جلوہ گر ہوا۔ اس ناول میں دو عبرت ناک قصے پیش کیے گئے ہیں۔ آہ مظلوماں میں مردوں کے ظلم وستم اور کثرت ازدواج کے منفی نتائج، امیری اور غریبی کی کشمکش بیان کی گئی ہے۔

ناول ''حرماں نصیب'' مصنفہ نے اس وقت لکھا تھا جب ان کا بھائی داغ مفارقت دے گیا تھا۔ یہ ناول بھائی بہن کی پاکیزہ محبت کی داستان ہے۔ بھائی کی جدائی کے بعد بہن دنیا سے کنارہ کر لیتی ہے، تنہا زندگی گزارتی ہے اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے غریبوں کا مفت علاج کر کے اپنے بھائی کو ایصال ثواب پہنچاتی ہے۔

حجاب امتیاز علی نے بھی اپنے ناولوں میں طبقۂ نسواں کی آزادی، فلاح و بہبودی، آزادئ نسواں اور معاشرتی اصلاح کو موضوع سخن بنایا ہے۔ حجاب امتیاز علی کے ناولوں میں ''میری ناتمام محبت''، ''ظالم محبت'' آزادی سے قبل کے ناول ہیں۔

ناول ''ظالم محبت'' ریختہ پر دستیاب ہے لیکن اس ناول پر سن اشاعت موجود نہیں۔ محترمہ نیلم فرزانہ نے عزیز احمد کے حوالے سے اس ناول کا سن اشاعت 1941 لکھا ہے۔ غلام محی الدین انصاری نے اپنی تصنیف ''ہند و پاک کی خواتین ناول نگار'' میں اس ناول کا سن اشاعت 1942 لکھا ہے۔ جب کہ ریختہ پر دستیاب ناول کے مقدمے میں جسے ڈاکٹر سید سجاد حیدر یلدرم نے لکھا تھا۔ اس مقدمے کے آخر میں سن اشاعت اور تاریخ 15 اگست 1940 درج ہے۔

ناول ''ظالم محبت'' کا مرکزی خیال سماجی اقدار کی پاسداری اور محبت کی ناکامی ہے۔ اس ناول میں امتیاز نے رئیسوں، نوابوں، امیر وامراء کی طرز زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ ناول ''ناتمام محبت'' کا سن اشاعت 1932 ہے۔ مذکورہ دونوں ناولوں کا موضوع محبت ہے۔

اکبری بیگم کا شمار بھی اولین خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے ان کے چار ناول ہیں۔ (گلدستہ، عفت نسواں، شعلہ پنہاں اور گودڑ کا لعل) تمام ناولوں میں سب سے زیادہ مقبول ناول ''گودڑ کا لال'' ہے جو مسلم خواتین کے لیے ترقی پسندی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت 1907 میں عمل میں آئی، جس میں پند و نصائح اور اصلاح معاشرے کے علاوہ خواتین میں ترقی پسند رجحان واضح نظر آتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن ثریا جبین بناء نقاب لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہے۔

نمائندہ خواتین ناول نگاروں میں صغریٰ ہمایوں مرزا اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ انھوں نے دگر خواتین ناول نگاروں کی طرح راشد الخری اور نذیر احمد ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ ناول ''سر گذشت ہاجرہ'' میں عورتوں کی اصلاح کے علاوہ، اس عہد کی سر گرمیاں، تغیرات، مشرقی اقدار اور روایات کی پاسداری کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یوں لگتا ہے کہ خود مصنفہ مرکزی کردار حاجرہ نبھا رہی ہوں۔ ہاجرہ کی معمولات زندگی کی سر گذشت کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کا ناول ''سر گذشتِ حاجرہ'' سے ہمیں عورتوں کا سیاسی شعور اجاگر ہوتا نظر آتا ہے۔ صغریٰ ہمایوں مرزا کا ناول ''سر گذشت حاجرہ'' 1930 میں شائع ہوا۔

ہمایوں مرزا کا پہلا ناول ''مشیر نسواں'' 1906 میں شائع کیا گیا۔ یہ ناول حسب روایت خواتین کی اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے، اس میں خواتین کی کامیاب زندگی کے لیے سبق آموز نصیحتیں پیش کی گئیں ہیں گویا یہ طبقہ نسواں کے لیے شمع ہدایت ہے۔

حواشی

(ڈاکٹر مجیب احمد خاں۔ حجاب امتیاز علی، حیات اور ادبی کارنامے۔ 1996)

(حجاب امتیاز علی فن اور شخصیت۔ ڈاکٹر مجیب احمد خاں۔ 2000ء)

(ظالم محبت۔ حجاب امتیاز علی۔ 1940)

(نذر سجاد حیدر۔ نجمہ۔ 1942)

(مذہب اور عشق۔ مصنفہ، نذر سجاد، 2004 مرتبہ قرۃ العین حیدر)

(دکھ بھری کہانی۔ نذر سجاد۔ 1926)

(دکھ بھری کہانی۔ نذر سجاد۔ 1935)

(جاں باز، نذر سجاد۔ 1953، چوتھا ایڈیشن)

(جاں باز، ثریا دو مشہور ناول۔ مصنفہ نذر سجاد حیدر۔ مرتبہ قرۃ العین حیدر۔ 2004)

(اختر النساء بیگم۔ مصنفہ نذر سجاد حیدر۔ مرتبہ قرۃ العین حیدر۔ سنِ اشاعت اول 2004

(اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار۔ نیلم فرزانہ-1992)

(ناول اصلاح النساء۔ 1881۔ رشید النساء، ریختہ اردو ویب سائٹ)

(شریف بیٹی۔ محمدی بیگم 1918)

(ہندو پاک کی خواتین ناول نگار۔ ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک 2008)

(ہوائے چمن میں خیمہ گل۔ کلیات۔ مصنفہ نذر سجاد، مرتبہ قرۃ العین حیدر۔ 2004)

(مشیر نسواں۔ مصنفہ۔ صغریٰ ہمایوں مرزا۔ 1906)

(سر گذشتِ ہاجرہ۔ صغریٰ ہمایوں مرزا۔ 1926)

(گودڑ کا لال۔ اکبری بیگم۔ 1907)

□□□

Dr. (Ms.) Syeda Naseem Sultana
Assistant Prof.
Osmania University
Main Rd, Amberpet
Hyderabad-500007 (Telangana)

ڈاکٹر شائقہ آفرین

اعجاز شاہین
کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی

اعجاز شاہین (1991-1940) نے تیرہ چودہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کردیا تھا لیکن 1962 سے باضابطہ لکھنے لگیں۔ ان کے افسانے ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ دو افسانوی مجموعے ''تصوراور تصویر'' (1975) اور ''یہ وادیاں'' (1984) شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکے ہیں۔ چونکہ وہ درس و تدریس سے جڑی ہوئی تھیں اس لیے زبان و بیان پر انھیں قدرت حاصل تھا۔ اردو گرلز اسکول پٹنہ میں پرنسپل کی حیثیت سے وہ بہت دنوں تک اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔ وہ خود عورت تھیں اور درس وتدریس سے جڑی تھیں اس لیے عورتوں کی اصلاح کو اپنا اولین فرض سمجھتی تھیں۔

یوں بھی عورت فطری طور پر قصے کہانی کی دلدادہ ہوتی ہے۔ قدرت کی طرف سے انھیں افسانہ طرازی کا ملکہ عطا کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اسے مردوں کے مقابلے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع ماضی میں کم ہی ملے ہیں۔ سماج میں مردوں کی حکمرانی، جہالت اور تحفظ و کفالت وغیرہ ایسی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے زندگی کے بیشتر شعبوں میں خواتین مردوں کے مقابلے بہت پیچھے تھیں۔ سماج میں تبدیلی، تعلیم کا فروغ اور مردوں کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی کی وجہ سے خواتین مردوں کے شانے سے شانہ ملا کر چلنے لگیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی عورتیں مردوں کے دوش بدوش چلنے لگیں۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ متوسط اور نچلے طبقے کی مسلمان عورتوں کی گھٹ گھٹ کر زندہ رہنے والی زندگی کو مؤثر انداز سے پیش کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اندھی عقیدت، فرسودہ رسم و رواج، جہیز کے بڑھتے ہوئے لین دین، جہالت اور عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔

اعجاز شاہین بھی اردو کی ایک ایسی ہی اہم افسانہ نگار تھیں لیکن ان پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سب سے زیادہ مسائل عورتوں کے پیش کیے۔ انھوں نے عورتوں کی مختلف صورت حال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھیں عورتوں سے ہمدردی تھی۔ وہ عورتوں کے مسائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی رہیں اور ان کے حل اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کرتی رہیں۔ ان کے دل میں عورتوں کا درد تھا اس لیے وہ بے بس، مظلوم اور استحصال زدہ عورتوں کے بارے میں سوچتی

تھیں۔انھوں نے اپنے ایک مضمون ''رہ گزرِ حیات'' میں خود ہی لکھا ہے:

''میرے اکثر افسانوں کا موضوع بے بس مظلوم عورت ہے۔قریبی حلقوں میں لوگ مجھے عورت پرست کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔مجھے انکار نہیں۔میرے دل میں عورت کا درد ہے۔میں نے تڑپتی، سسکتی عورت کو دیکھا ہے۔اور ان مردوں کو بھی جو عورتوں کا حق دبائے بیٹھے ہیں۔انہیں کبھی سماج کا خوف دلا کر ڈراتے ہیں۔بے چاری عورت جو سراپا ایثار و وفا ہے۔اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ اس نے اپنا حق پالیا ہے۔حالانکہ جائز حق کے لیے ابھی اسے پورے سماج سے لڑنا ہے۔متحد ہو کر آواز اٹھانی ہے۔''

(بحوالہ ''بہار و جھارکھنڈ میں اردو افسانہ اور افسانہ نگار (جلد دوم) ڈاکٹر قیام نیر، ص:33)

اعجاز شاہین کو کہانیاں لکھنے کی تحریک بھی عورتوں ہی سے ملی ہے۔ وہ فن کا پورا خیال رکھتی ہیں۔یوں تو انھوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں خواتین کے مسائل ہی کو پیش کیا ہے۔لیکن کچھ افسانوں میں جیسے ''تصور اور تصویر''، ''آئینہ''، ''ممتاز آپا'' اور ''ضمیر کی آواز'' وغیرہ میں انھوں نے عورتوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جب تک وہ اپنا مقام خود بلند کرنے کی کوشش نہیں کریں گی تب تک ان کا مقام بلند نہیں ہوگا۔مصنفہ نے ان افسانوں کے ذریعہ خواتین کے اندر خود اعتمادی پیدا کر کے حالات سے لڑنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب عورت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ مرد کے احساس کو لہولہان بھی کر سکتی ہے۔محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''ان کی کہانیوں کے سارے کردار ہمارے جانے پہچانے ہیں۔ہر کردار اپنی بھاشا، بولی اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ان کا ہر کردار مثالی ہوتا ہے۔طبقۂ نسواں سے تعلق اور ہمدردی کے باوجود ان کی نگاہ اس طبقہ کی کمزوریوں پر بھی مرکوز رہتی ہے۔'' (نقد آزاد، محمد حسین آزاد، ص:42)

زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حادثات کو اعجاز شاہین نے اپنے افسانوں میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے جو عورتوں کے دلوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔عورتوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ ساتھ حالات کی ستم ظریفی کو انھوں نے افسانوں کے ذریعہ قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔وہ عورت کی محبت، اس کی وفا، خود سپردگی، اس کی قربانی اور اس کی شکست خوردگی کو اپنے افسانوں میں متاثر کن انداز میں پیش کرتی ہیں۔یوں تو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں خواتین استحصال کا شکار رہی ہیں۔ادب کی تخلیق کرنے والوں نے ہر دور میں عورت پر قلم اٹھایا ہے۔پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے بسی، استحصال، کم عمری کی شادی اور مردوں کی دست نگر ہونے کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو دوسری طرف سجاد حیدر یلدرم اور ان کی راہ پر چلنے والے دوسرے افسانہ نگاروں نے عورت کی محبت اس کی خود سپردگی، اس کے حسن ادا اور اس کی بے وفائی کے تذکرے کیے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے شعر و ادب میں طبقۂ نسواں کے مسائل نے اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ جگہ پائی ہے۔عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ سماج میں اس کی محرومی اور نابرابری اور اس کے مسائل سے بے توجہی کو ترقی پسندوں نے پوری سچائی کے ساتھ قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اعجاز شاہین نے بھی عورتوں کے مسائل سے باتیں کی ہیں۔وہ عورتوں کی نفسیات سے بھی اچھی طرف واقف تھیں۔مسز شبنم خاں ان کی افسانہ نگاری کے سلسلہ میں فرماتی ہیں:

''اعجاز شاہین کی کہانیوں کا موضوع وہ زندگی ہے جس کو وہ گزار چکی ہیں۔یا گزار رہی ہیں۔روز مرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات جو مرد کے لیے بھلے ہی اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن صنفِ نازک کے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان گنت نقوش چھوڑ جاتے ہیں، ایسے ہی واقعات اور حادثات کو بڑے ہی دلنشیں انداز میں اعجاز شاہین اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔عورتوں کے مختلف موضوعات ان کے بے بس جذبات اور حالات کی ستم ظریفی کو افسانے میں ڈھالنے کا فن اعجاز شاہین خوب جانتی ہیں۔''

(مسز شبنم خاں، ماہنامہ ''زبان و ادب'' پٹنہ جلد ۱۷، شمارہ 4، ص:8)

اعجاز شاہین نے خواتین کی بے بسی کا ذکر تو کیا ہی ہے لیکن گھٹ گھٹ کر جینے والی عورتوں میں ایک نئی طاقت اور ایک نیا عزم پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔یوں تو آج کی عورتیں ہر میدان میں مردوں سے قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہیں لیکن اب بھی بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو باہر کی دنیا سے بے خبر ہیں۔آج وہ گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہیں۔ڈاکٹر عبدالمغنی کے مطابق:

''اعجاز شاہین نہ صرف اپنے فن کا شعور رکھتی ہیں بلکہ انہوں نے انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ بھی بغور کیا ہے۔یہ مطالعہ گھریلو زندگی کے معاملات اور ان سے پیدا ہونے والے احساسات سے متعلق ہے اور یہی اعجاز شاہین کے فنی

عمل کا خاص دائرہ ہے....انھوں نے اپنے موضوعات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے جن کے متعلق ان کی کافی معلومات اور تجربات ہیں۔ بہر حال ان معلومات و تجربات میں حالات کی ستم ظریفی اور خاص کر کرداروں کے احساس محرومی کا فن کا پہلو غالب ہے۔ یعنی درد و داغ کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے اور جستجو و آرزو کی کم لیکن خوبی یہ ہے کہ اس کیفیت میں تلخی اور بے زاری کے بجائے دردمندی اور ہمدردی کا انداز پایا جاتا ہے۔''

(ڈاکٹر عبدالمغنی پیش لفظ،تصور اور تصویر، اعجاز شاہین، ص:6)

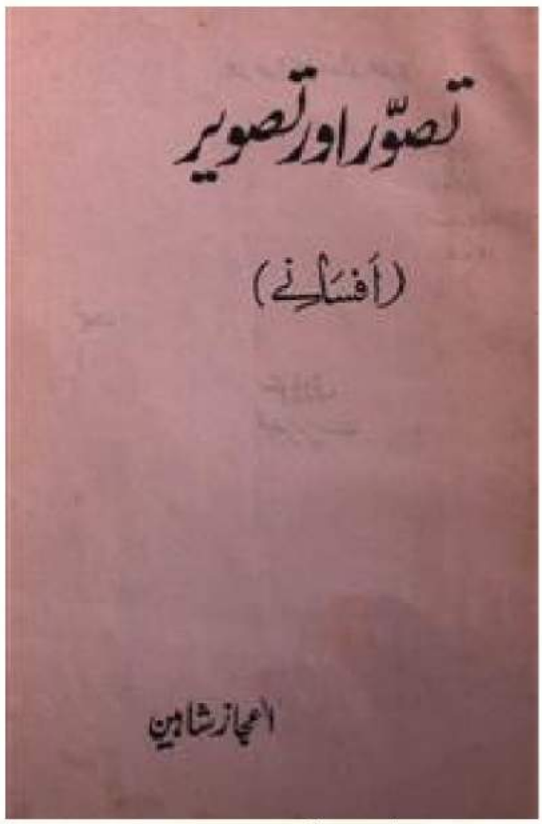

اعجاز شاہین کی طرح کچھ خواتین افسانہ نگار جیسے رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، ممتاز شیریں، خدیجہ مستور، لیلیٰ لکھنوی، قیصر جہاں وغیرہ نے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کو بھی سامنے لانے کی کوششیں ہے۔ اعجاز شاہین نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں نسوانی کرداروں کو ہی پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے نسوانی کرداروں کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ رضوان احمد فرماتے ہیں:

''اردو افسانے میں خواتین نسبتاً دیر سے آئیں تو اس برق رفتاری سے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی خواتین صف اول میں نظر آنے لگیں۔ اور ان میں سے متعدد نام تو اردو ادب کی آبرو بن گئے۔

محترمہ اعجاز شاہین بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ ان کے افسانے گہری معنویت کے حامل ہیں۔ اس لیے وہ قاری کو چونکاتے بھی ہیں اور تادیر سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔''

(ناشر کے قلم سے، رضوان احمد، مشمولہ ''تصور اور تصویر''۔ اعجاز شاہین، ص:8)

عورتوں کی بات چیت محاورے اور ضرب الامثال کو جس حسن خوبی سے اعجاز شاہین پیش کرتی ہیں وہ دوسری خاتون افسانہ نگاروں کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کی بات چیت کو عورتوں ہی کی زبان میں پیش کیا ہے۔

اعجاز شاہین صاف ستھری اور عام فہم زبان استعمال کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں دوٹوک بات کہہ جاتی ہیں اس لیے ان کا اسلوب اور طرز اظہار پرکشش ہوتا ہے:

''اجی ابھی کنواری ہیں ان کی عمر 38 سال ہے۔ تیکھا نقشہ، نرم اور اجلی جلد مگر چہرے پر عمر گزارنے کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ اگر چہ دور جدید کے مسائل نے آنکھوں کی چمک کو دھندلا کر دیا ہے، پھر بھی اس دھند کے پیچھے دور اندیشی اور ذہانت ٹپک رہی ہے۔ ان سے بڑی ننھی جان ہے۔ عمر بیالیس سال۔ دو سال قبل ان کی شادی ہو چکی ہے۔ ابا خاندانی زمیندار ہیں۔ ایک کوٹھی فروخت کر کے ادھورا سا داماد خرید لیا جو داماد کم غلام زیادہ نظر آتا ہے۔ ننھی جان تیز مزاج اور مغرور ہیں۔ شوہر ان سے ڈرتے ہیں اور دبتے ہیں۔''

(کھوٹہ سکہ)

''کچی کلی''، ''دو بوند آنسو''، ''آج کی نسلیں''، ''کھوٹہ سکہ''، ''اعتراف''، ''ضمیر کی آواز''، ''تصور اور تصویر'' اور ''صور اسرافیل'' وغیرہ اعجاز شاہین کے عمدہ افسانے ہیں۔

Dr. Shaika Afrin
Govt. Urdu School Nazra
P.O. Meghwan, Via: Benipatty
Dist: Madhubani (Bihar)
PIN: 847102

محمد فرحان خان

ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی۔ایک جائزہ

ہندوستان میں آبادی کے حساب سے مسلم قوم ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہے۔ 2011 کی مردم شمادی کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 14.23 فی صد تھا۔2018 کے اعداد وشمار میں کل مسلم آبادی تقریباً 19 کروڑ طے پائی ہے۔مختلف تحقیقی تجزیوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم دیگر اقوام کے مقابل زیادہ پسماندہ ہے اور تعلیمی سطح پر مسلمانوں کی صورت حال بھی بے حد افسوس ناک ہے۔مردوں کی بہ نسبت مسلم خواتین کی تعلیمی سرگرمیاں مزید تشویش ناک ہیں۔2011 کی مردم شماری میں کل مسلم خواندگی کی شرح 57.15 فیصد درج کی گئی تھی جس میں 62.41 فیصد مسلم مردوں اور 51.09 فیصد مسلم خواتین کا تناسب خواندگی تھا حالانکہ ہندوستان میں مجموعی خواندگی تناسب 74.04 فیصد تھا جس میں 82.14 فیصد مردوں اور 65.46 فیصد خواتین کا حصہ تھا۔مسلم مردوں (37.59) کے مقابلے میں خواتین کی ناخواندگی کی شرح 48.01 تھی۔اس سے پہلے 2001 کی مردم شماری میں کل مسلم خواندگی کا تناسب 59.01 فیصد درج ہوا تھا جس میں مردوں کی تعداد 67.06 فیصد اور خواتین 50.01 فیصد پر تھیں ۔ اس وقت ہندوستان کی مجموعی شرح خواندگی کا تناسب تقریباً 64.83 فیصد تھا لہٰذا مذکورہ تمام اندراج اور اعداد

وشمار کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک خواتین کی تعلیمی کارکردگی مردوں کے مقابلے زیادہ خراب رہی ہے۔ خواتین کی مجموعی شرح خواندگی میں مسلم خواتین کا تعلیمی تناسب آج بھی حاشیے پر ہے۔

ہندوستان میں خواندگی شرح (مردم شماری 2011)

مرد خواندگی کی شرح	82.14%
خواتین کی خواندگی شرح	65.14%
ہندوستان میں مجموعی خواندگی شرح	74.04%

ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح خواندگی (مردم شماری 2011)

مسلم مرد خواندگی کی شرح	62.41%
مسلم خواتین کی خواندگی شرح	51.09%
ہندوستان میں کل مسلم شرح خواندگی	57.15%

ہندوستان میں شرح خواندگی (مردم شماری 2001)

مرد خواندگی کی شرح	75.26%
خواتین کی خواندگی شرح	53.67%
ہندوستان میں مجموعی خواندگی شرح	64.83%

ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح خواندگی (مردم شماری 2001)

مسلم مرد خواندگی کی شرح	67.06%
مسلم خواتین کی خواندگی شرح	50.01%
ہندوستان میں کل مسلم شرح خواندگی	59.01%

ہندوستان میں صنفی اور مذہبی طبقے کے لحاظ سے شرح خواندگی اور تمام مذہبی طبقے
(مردم شماری 2011)

ناخواندہ مردوں کی تعداد فیصد	30.24%
ناخواندہ خواتین کی تعداد فیصد	44.02%
ناخواندہ مسلم مردوں کی تعداد فیصد	37.59%
ناخواندہ مسلم خواتین کی تعداد فیصد	48.01%

ہندوستان میں ناخواندہ آبادی کے فیصد میں دیہی اور شہری تقسیم (مسلم اور غیر مسلم)

دیہی علاقوں میں تمام ناخواندہ مذہبی طبقے	42.09%
شہری علاقوں میں تمام ناخواندہ مذہبی طبقے	25.53%
دیہی مسلم طبقہ	48.17%
شہری مسلم طبقہ	34.05%
دیہی غیر مسلم طبقہ	41.52%
شہری غیر مسلم طبقہ	23.96 %

9 مارچ 2005 کو وزیر اعظم نے ہندوستان کے مسلم فرقے کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی مطالعہ کی غرض سے ایک رپورٹ تیار کرنے کے لیے ایک اعلیٰ کمیٹی (سچر کمیٹی کی رپورٹ) تشکیل دی تھی۔ اس رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ آزادی کے بعد سے ہندوستان نے اہم پیش رفت کی ہے۔ اس نے غریبی کم کرنے اور خواندگی، تعلیم اور صحت جیسے اہم انسانی ترقیاتی اشاریوں کو بہتر کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایسے آثار بھی موجود ہیں کہ تمام مذہبی فرقوں اور سماجی طبقوں (جنھیں اب سماجی و مذہبی زمرہ یا SRC کہا جائے گا) کو ترقیاتی عمل کے ثمرات میں برابر کا حصہ نہیں ملا ہے۔ ان فرقوں میں مسلمان جو ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور ملکی آبادی میں جن کا تناسب (Ratio) 13.04 فیصد ہے بیشتر انسانی ترقیاتی اشاریوں کے لحاظ سے حد درجہ پیچھے ہیں۔ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر احساس محرومی پایا جاتا ہے مگر آزادی کے بعد سے آج تک مذہبی اقلیتوں کی سماجی و اقتصادی حالت کا تجزیہ کرنے کی کوئی منظم اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ مجموعی طور پر اس رپورٹ میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد ہر اعتبار سے آج بھی حاشیے پر ہے، رہی بات مسلمانوں کی تعلیمی حالت کی تو مزید افسوس کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں مسلم خواتین اپنے تعلیمی تنزلی پر فکر مند ہیں اور اپنی حالت کو تبدیل کرنا چاہتی ہے لیکن محدود وسائل کے سبب مجبور ہیں غرض کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ میں اعداد شمار کے تحت واضح کر دیا گیا ہے کہ مسلم خواتین کی زندگی کے دیگر تمام امور (آمدنی، روزگار، تعلیم، تحفظ اور تغذیہ تک) کو خارج کر کے صرف شادی کے ضابطوں، طلاق کے حق اور نان نفقے کے امور کو صنفی انصاف کی بنیاد بنا دیا گیا ہے۔

مسلم خواتین آج بھی اپنے تشخص کے بحران، سماج میں ثانوی حیثیت اور خاندانی امتیازی سلوک کی شکار ہیں۔ امتیازی سماجی و ثقافتی سلوک کے سبب خواتین کا درمیان میں ترک تعلیم کا رجحان کثرت سے پایا جاتا ہے۔ خواتین بالخصوص کم سن لڑکیوں پر رسمی پابندیوں اور روک ٹوک کا دباؤ مثلاً ان کی ذاتی زندگی، اخلاقیات، طور طریقے اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے پر مستقل نگاہ رکھی جاتی ہے جس کے سبب خواتین احساس کمتری کا شکار ہو کر مستقبل کی راہ سے بھٹک جاتی ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ دیہی علاقوں میں یہ رویہ زیادہ سخت اور پیچیدہ ہے۔ خواتین کے معاملات میں یہ

سنگین رواج قدامت پرستی کے برعکس مذہب پرستی تک تصور کیے جاتے ہیں لہٰذا خواتین ذہنی وجسمانی تحفظ کے ساتھ ساتھ تشخص کے تحفظ سے بھی محروم ہیں اوران تمام مسائل کی بنیادی وجہ انھیں تعلیم کے مناسب مواقع مہیا نہ ہونا ہیں۔اس صورت حال کا اثر اتنا شدید ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم کے نام پر سرکاری اورنجی کالج میں داخل تو کرادیا جاتا ہے لیکن وہ گھر بیٹھ کر تعلیمی سال مکمل کرتی ہیں محض سال میں امتحانات کے وقت وہ کالج کا منہ دیکھ پاتی ہیں جس کے سبب ان کی ذہنی نشونما اور خوداعتمادی میں خاصہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

خواتین کا تعلیم سے محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سماج میں انھیں تحفظ فراہم نہیں ہے۔مسلم خواتین اس پیچیدہ صورت حال میں زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہیں۔گھر سے قریب کالج نہ ہونا اور دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنا ان کے لیے دشوار ہے کیونکہ سب سے بڑا مسئلہ ان کے تحفظ کا ہے۔ ویمنس کالج کی تعداد کم ہونا، ہاسٹل کی سہولت نہ ہونا، خواتین اساتذہ کم ہونا اور روزانہ کالج آنے جانے کی دشواریاں بھی ایک اہم مسئلہ ہے لہٰذا والدین اپنی لڑکیوں کو ایسے معاندانہ ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت آسانی سے نہیں دیتے۔

خواتین کی طرز رہائش اور طرز تعلیم کے لحاظ سے مذہبی پابندیاں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں نیز کہ اولیت کے درجہ پر فقط سوسائٹی کے اصول وضوابط اور غیر رسمی طریقہ کار ہیں۔دوسری اور علیحدہ وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم اقلیتی مدرسوں کے مقابلے میں نہ معیاری اسکول ہیں نہ کالج، جن میں لڑکیوں کی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہو اور سماج میں خواتین کی شخصیت واضح ہو سکے۔مدارس برائے خواتین کی تعداد چونکہ گنی چنی ہے لیکن ان میں خواتین کی اچھی خاصی تعداد زیر تعلیم ہے۔وہیں عصری اور دنیوی تعلیم میں مسلم خواتین کی صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔سچر کمیٹی کی رپوٹ کے مطابق مسلمانوں کی مجموعی شرح خواندگی میں 4 فی صد مدارس کے طلبہ و طالبات کی حصہ داری ہے لہٰذا غور کرنے والی بات یہ ہے کہ زیر بحث اعداد و شمار میں صنفی تفریق از حد نمایاں ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خاص سبب مسلم طبقے کی غریبی، بے روزگاری اور محدود وسائل ہیں جس کے تحت بچے تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں اور لڑکیوں کے تعلیمی رجحان میں یہ کمی شدت سے نمایاں ہے۔عموماً یہ بچے دوکانوں، ڈھابوں، کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور لڑکیاں گھروں میں سلائی، بنائی، کڑھائی، کشیدہ کاری، زری اور چکن کا کام، اگربتی، موم بتی، چھلوں کی بنائی، بیڑی سازی، دری اور قالین کی بنائی وغیرہ کے روزگار سے وابستہ ہیں۔خواتین دوسروں کے گھروں میں جھاڑو پوچھے کی آمدنی سے اخراجات پورے کرتی ہیں۔مختصر یہ کہ مسلمانوں میں ناخواندگی کی اصل وجہ غریبی بے روزگاری ہے۔محدود وسائل کی بنا پر مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اپنی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرانے کے انکاری ہیں چنانچہ غریبی ہر لحاظ سے مسلمانوں کی تعلیم تک رسائی میں مانع ہے۔

2001 کی مردم شماری میں مسلمانوں کی آبادی 13 کروڑ 80 لاکھ تھی۔1961 کے بعد سے 1990 کی دہائی تک ہندوستان کی آبادی میں تقریباً 20 فیصد اضافہ ہوا یعنی 1961 کے بعد ہر دہائی میں آبادی تقریباً 20 فیصد کی شرح سے بڑھتی رہی۔اسی طرح 1961 سے 2001 تک چالیس سال کے عرصے میں آبادی 43 کروڑ 90 لاکھ سے ایک ارب 2 کروڑ 90 لاکھ ہوگئی۔اس لحاظ سے مسلمانوں کی آبادی 4 کروڑ 70 لاکھ سے 13 کروڑ 80 لاکھ ہوگئی جو کل آبادی میں مسلمانوں کی آبادی کا 30 فی صد اضافہ تھا۔2011 کی مردم شماری کے مطابق 1000 مردوں پر 944 خواتین تھیں۔2001 سے 2011 کے درمیان ہندوستان کی کل آبادی میں 17.64 فی صد اضافہ ہوا ہے۔اس ضمن میں 2018 کے سروے کے مطابق مسلمانوں کی کل آبادی تقریباً 19 فیصد تصور کی گئی ہے۔

حالیہ تحقیقی تجزیوں میں دنیا کی بیشتر آبادیوں میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔مجموعی طور پر پیدائش کا تناسب 100 لڑکیوں پر 105 لڑکوں کا ہے لیکن خواتین کے مقابلے مردوں میں زیادہ شرح اموات کے سبب آبادی میں صنفی تناسب خواتین کے موافق ہو جاتا ہے تاہم ہندوستان میں یہ صورت حال قدر مختلف ہے۔ہندوستان میں خواتین کی شرح اموات مردوں سے زیادہ ہے لہٰذا اس وقت 1000 مردوں میں خواتین کی تعداد تقریباً 944 سے 955 تک ہے۔

یہی صورت حال کم وبیش مسلمانوں میں بھی یکساں ہے۔ صنفی تناسب عام آبادی کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔ صنفی اعتبار سے مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس پس منظر کے تحت دیکھا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کے حساب سے خواتین کا تعلیمی انحطاط بہت نمایاں ہے۔ پچھلی دہائی کے مقابلے میں مردوں سے زیادہ 24 لاکھ خواتین کو تعلیمی ترقی حاصل ہوئی ہے لیکن مسلم خواتین کی شرح خواندگی میں مزید اضافہ نہیں ہوا ہے۔

2001 کے اعداد وشمار سے پتا چلتا ہے کہ مسلم خواندگی کی شرح 59.01 فیصد تھی۔ شہری علاقوں میں مسلمانوں کی خواندگی شرح 70.01 اور دیہی علاقوں میں 52.07 فیصد تھی۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت بہت سست اور خراب رہی ہے۔

انڈیا ہیومن ڈیولپمنٹ سروے 05-2004 اور NSSO کی 61 ویں رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان بچوں کے داخلوں میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن 6 سے 14 سال کے تقریباً 25 فیصد بچے ایسے ہیں جنھوں نے کسی اسکول میں داخلہ نہیں لیا یا پھر درمیان میں تعلیم چھوڑ دی۔ مسلمانوں میں ترک تعلیم کا رجحان دوسروں سے کہیں زیادہ ہے جس میں مسلم لڑکیاں کثیر تعداد میں ہیں۔

NSSO کی 75 ویں راؤنڈ رپورٹ کی بات کی جائے تو 35 سے 3 سال کی عمر کی 22 فیصد مسلم لڑکیوں نے کبھی باضابطہ کسی کورس میں داخلہ نہیں لیا۔ اسکول کی سطح پر مسلمان لڑکیوں کی حاضری اور داخلوں میں نمایاں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔

مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم پر اگر نگاہ کی جائے تو تمام اعداد وشمار اس طرح نظر آتے ہیں۔

آل انڈیا سروے آن ہائیر ایجوکیشن 18-2017ء کی رپورٹ کے مطابق اعلیٰ تعلیم میں مسلم طلبہ وطالبات کا پچھلے پانچ سالوں میں 18 فیصد سے 37 فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے آل انڈیا سروے آن ہائیر ایجوکیشن (15-2014) کے مطابق محض 04.04 فیصد مسلم طلبہ و طالبات اعلیٰ تعلیم سے وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے اعلیٰ تعلیم کی مجموعی شرح 5 فیصد میں مسلم طالب علم ترقی پر ہیں 14-2013 کے اعداد وشمار میں 12.80 لاکھ مسلم طالب علم اعلیٰ تعلیم سے وابستہ تھے جو اعلیٰ تعلیم کے کل تناسب کا 4 فیصد ہے۔ مجموعی طور پر اعلیٰ تعلیم میں مسلم طالب علم کل 4 فیصد ہیں۔

اس طرح پچھلے پانچ سالوں میں مسلم خواتین کے اندراج میں 46 فیصد اضافہ ہوا ہے جو تمام تعلیمی زمرے کے مجموعی اعداد وشمار میں 24 فیصد اضافہ تھا اور ان پانچ سالوں میں مسلم خواتین کی مجموعی تعلیم کی شرح میں 1 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ UNESCO (2015) کی رپورٹ کی بات کریں تو اس میں بھی واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں مجموعی بالغ خواندگی کا تناسب 81 فیصد اور نوجوانوں میں مجموعی خواندگی کا تناسب 91.66 فیصد ہے۔

UNESCO کے اعداد وشمار 2015

ہندوستان میں بالغ شرح خواندگی	81%
ہندوستانی نوجوانوں میں شرح خواندگی	91.66%

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر مسلمانوں کی مجموعی خواندگی شرح تقریباً 7.70 فیصد ہے جس میں مسلم مردوں کی تعلیمی شرح تقریباً 9.09 فیصد ہے اور خواتین کی تعلیمی شرح تقریباً 6.16 فیصد ہے۔ اس کے برعکس گریجویشن کی سطح پر مجموعی خواندگی شرح تقریباً 6.84 ہے جس میں 7.77 فیصد مرد اور 5.81 فیصد خواتین ہیں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے کل خواندگی تناسب (74.04) میں مسلمانوں کی تعلیمی کارکردگی کسی طور قابل اعتراف نہیں ہوسکتی۔

اعلیٰ تعلیم میں ہندوستانی مسلمان طبقے کا فیصد

اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی کل شرح خواندگی	07.70%
اعلیٰ تعلیم میں مسلم مرد خواندگی کی شرح	09.09%
اعلیٰ تعلیم میں مسلم خواتین کی شرح خواندگی	06.16%
گریجویشن میں کل مسلم طلبہ وطالبات کا فیصد	06.84%
گریجویشن میں مسلم طلبہ	07.77%
گریجویشن میں مسلم طالبات	05.81%

ہندوستان کے تعلیمی اداروں مثلاً نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن (NIEPA) سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن (CBSC) اور نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکنامک ریسرچ (NCAIR) کے علاوہ اعلیٰ تعلیمی اداروں مثلاً انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (IIMs) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (IITs) انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی (IIIT) کالج، یونیورسٹی اور MHRD کے اعداد وشمار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں مسلم طالب علموں کی تعداد آبادی کے تناظر میں بہت کم ہے۔

تمام تحقیقی تجزیوں پر غور کیا جائے تو نتیجہ کے طور پر 20 سال کی عمر کے صرف 7 فیصد طالب علموں نے گریجویشن یا ڈپلوما کیا ہے۔ گریجویشن کی

سطح پر مسلمانوں کا تناسب محض 4 فیصد ہے اور تکنیکی تعلیم کی ڈگری والے 18 سال یا اس سے زیادہ عمر کے طالب علموں کا تناسب ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اس ضمن میں مجموعی طور پر لڑکیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ۔مسلمانوں میں گریجویشن مکمل کرنے والوں کی مجموعی تعداد 40 لاکھ سے کم ہے جو کل مسلم آبادی کا 3.6 فیصد حصہ تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح تکنیکی ڈگری والوں کا تناسب 0.4 فیصد ہے۔ حالیہ تحقیقی تجزیوں اور NSSO کی راؤنڈ رپورٹ کے مطابق مسلمانوں میں گریجویٹ محض 6 فیصد ہیں۔ تکنیکی گریجویٹ کا تناسب فی 1000 افراد میں 2 مسلمانوں کا ہے ۔ پوسٹ گریجویشن میں یہ تناسب 4 سے 7 فیصد ہے۔

علاوہ ازیں ملک کے مختلف معروف اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلم امیدواروں کی شمولیت پر غور کریں تو IITs اور IIMs جیسے اداروں میں مسلم طالب علم محض 1.3 فیصد ہیں جن میں خواتین کی حصہ داری آدھے سے بھی کم ہے۔

سائنس، آرٹس اور کامرس کے UG کورسز میں 25 طلبہ وطالبات میں صرف 1 سے 3 تک مسلم طالب علم ہیں ۔ PG میں ہر پانچ طالب علموں میں ایک مسلم طالب علم ہے ۔ مجموعی تعداد کے حوالے سے یو.جی کورسز میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کچھ بہتر ہے ۔MBA میں مسلم طالب علم محض ایک فیصد اور میڈیکل کورسز میں محض چار فیصد ہیں۔ ان تمام کورسز میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے برعکس خواتین کی کل تعلیمی شرح 1.4 فیصد تک ہے۔

گذشتہ برسوں میں مسلم آبادی کے ساتھ ساتھ گریجویٹ اور تکنیکی گریجویٹ کی مجموعی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ خواندگی تناسب دوسرے طبقوں کے مقابلے بہت کم ہے ۔ یہ فرق بدستور مردوں اور خواتین دونوں میں نمایاں ہے لیکن شہری خواتین کے مقابلے میں دیہی خواتین کی تعلیمی دلچسپی میں ضرور اضافہ ہوا ہے ۔ گذشتہ چند برسوں میں خواتین کی تعلیمی ترقی کچھ حد تک بہتر ثابت ہوئی ہے لیکن خواتین کو تعلیمی مواقع زیادہ میسر نہیں آئے ہیں کیونکہ مسلم خواتین کی ناخواندگی شرح کی بات کریں تو وہ آج بھی 48.1 فی صد ہے جو مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

اب تک کے تحقیقی مطالعے اور تمام اعداد و شمار کے حوالے سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام و معیار وہ نہیں جو ہونا چاہیے تھا۔ تعلیمی پسماندگی کی وجہ محض سرکاری پالیسیاں درکار نہ ہونے تک نہیں ہے بلکہ ہم خود ذمہ دار ہیں۔ تعلیمی سطح پر دیکھا جائے تو مسلمانوں میں کرپشن کا رواج سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ ایسی صورت میں مسلم خواتین تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی ناخواندہ ہیں۔

□□□

Mohd Farhan Khan
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligagh-202001 (U.P)

توصیف بریلوی

اردو ادب میں ماحولیاتی تانیثیت

(تعارف، اہمیت، مقاصد، جائزہ اور معروضات)

آج دنیا کے ہر ادب میں فیمنزم یعنی تانیثیت پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور مزید لکھے جانے کے امکان بھی ہیں۔ قدیم اردو ادب اور بالخصوص قدیم اردو شاعری میں عاشق ہمیشہ اپنے محبوب کا ستایا ہوا اور سرد مہری کا گلہ زبان پر لیے ہوئے دم توڑتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی اس کے ابرو تو کبھی زلف سے گھائل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ایسے ادب کی ضرورت تھی جو عورتوں کے مسائل کو پیش کرے حالاں کہ بارہ ماسہ میں بھی عورتوں کے جذبات کی فراوانی ملتی ہے لیکن صنف نازک کے مسائل کا احاطہ اس میں بھی مکمل طور پر نہیں ہو سکتا تھا نتیجتاً جدید دور میں تانیثیت کے لیے آوازیں بلند ہوئیں۔ جن میں بالخصوص تو نسوانی حقوق اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ یہ بلند آوازیں دنیا کے بیشتر ادب نے قبول کیں تو اردو ادب بھی اس سے دور کیوں رہتا۔ بہر کیف......!

تانیثیت کے بعد ماحولیاتی تانیثیت (Ecofeminism) کا احساس بیدار ہوا تو اس طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ یہ دور ہے مشینوں کا، آلودگی کا اور گلیشیر کے پگھلنے کا۔ قدرتی چھیڑ چھاڑ سے انسان اور جانور سبھی کو نقصان ہے۔ عورت قدرت کے زیادہ قریب مانی جاتی ہے۔ وہ چیزوں کو کس طرح سے دیکھتی ہے؟ اپنے ماحولیاتی نظام کے بیچ کیا سوچتی ہے؟ اور وہ ماحولیاتی نظام کو بنائے رکھنے میں کس طرح معاون ہے؟ اسی طرح کے دیگر سوالات کا جواب ماحولیاتی تانیثیت اور اس سے متعلق ادب میں ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایکوفیمنزم فرنچ سے انگریزی اور پھر اردو میں آیا۔ یہ دو لفظوں Eco اور Feminism سے مل کر بنا ہے۔ Ecology جسے سمجھنا آج کے وقت کی ضرورت ہے۔ انسان نے جہاں ہر میدان میں ترقیاں حاصل کیں تو وہیں ماحولیات یعنی Ecology،Environment اور Ecosystem کو بہت متاثر بھی کیا ہے۔ اس متاثر اور مجروح ماحولیات کی بازیافت اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔ Feminism یعنی تانیثیت اردو ادب میں کافی وقت سے موجود ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ مغرب میں تانیثیت کو لے کر جس طرح آوازیں بلند ہوئیں اردو میں اس سے اجتناب کیا گیا لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ اب تک اردو میں تانیثی ادب اور تنقید پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان دونوں لفظوں Eco اور Feminism کے اشتراک سے Ecofeminsm لفظ وجود میں آیا۔ جس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسا رجحان جس میں تانیثی فکر تو ہو ہی ساتھ ہی ماحولیات کی حمایت بھی۔ یوں سمجھیں کہ تانیثیت کے دائرے میں ماحولیات کی بقا کی گفتگو کرنا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت فطرت سے زیادہ قریب ہوتی ہے شاید اسی لیے Nature Girl جیسی اصطلاح بھی خلق کی گئی۔ انگریزی میں Carl Hiaasen نے 2006 میں Nature Girl ناول لکھا تھا۔ عورت کی سرشت میں داخل ہے فطرت کو زیادہ محسوس کرنا، اس سے محظوظ ہونا اور اس سے سکون حاصل کرنا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عورت میں صبر و سکون اور توکل کا مادہ مردوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ان میں ایک

عظیم جذبہ ممتا کا بھی ہوتا ہے جس سے مرد عاری ہیں۔ دیگر وجوہات بھی ہوں گی میری رائے حتمی نہیں اور نہ ہی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرد حضرات فطرت سے دور رہتے ہیں۔ شہروں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے جہاں چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے ہیں وہاں بھی عورتیں گملوں میں پودے لگا کر ان کی آبیاری کرتی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو پیڑ پودے ہم سے الگ نہیں ہیں انھیں بھی زندہ رہنے کے لیے آکسیجن چاہئے اور ہمیں بھی۔ میری بات کا لب لباب صرف اتنا ہے کہ ماحولیاتی تانیثیت کا جو نظریہ/ رجحان ہے اس کے تحت عورتوں کے مسائل تو ہیں ہی ساتھ ہی ماحولیات کے مسائل بھی ہیں۔ وہ اس لیے کیوں کہ ماحولیات کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے عورتوں نے بہت تعاون کیا۔ خود ہندوستان میں ''چپکو آندولن'' چلایا گیا جس میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور پیڑوں کو کٹنے سے بچایا تھا۔ صرف یہی نہیں اس میں اور بھی بہت سے Issues شامل ہیں۔ Social Ecofeminism، Libral Ecofeminism، Economic Ecofeminism اور Vegetarian Ecofeminsim وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا Issues تفصیل طلب ہیں اس لیے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ماحولیاتی تانیثیت اردو میں بھی جلدی ہی ابھر کر سامنے آئے گی۔ حال ہی میں Ecofeminism پر اردو میں ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کی کتاب ''ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ'' منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف ماحولیاتی تانیثیت پر بحث کی ہے بلکہ تانیثیت اور ماحولیات پر بھی پر مغز گفتگو کی ہے۔ اس میں انھوں نے کچھ ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف اور ان کے افسانے بھی شامل کیے ہیں۔ اخیر میں ان افسانوں پر تنقیدی اظہار بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے جس میں ماحولیاتی تانیثی تنقید نمایاں ہے۔ میرے نزدیک اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں Ecofeminism پر بحث کی گئی ہو اور اس سے متعلق کچھ افسانے یکجا کیے گئے ہوں۔ نسترن احسن فتیحی اپنی کتاب میں تانیثی ماحولیات کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''Ecofeminism (ایکو فیمنزم) ایک ایسا ادبی نظریہ ہے جو حقوق نسواں کے مختلف شعبوں مثلاً تحریک امن (Peace movements)، خواتین کی صحت (Women's health care)، ماحولیاتی تحریکات (Environmental movements) اور جانوروں کی آزادی (Animal Libration) جیسی تحریکوں سے نمو پذیر ہوا ہے۔ ماحولیات، تحریک نسواں اور سوشلزم کی بصیرت سے ماخوذ ایکو فیمنزم کے فلسفیانہ اساس کا ماننا ہے کہ وہ قوتیں جو نسل، طبقاتی فرق، صنفی یا جنسی فرق اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر استحصال کرتی ہیں وہ فطرت کے استحصال سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ایکو فیمنزم نسلی، طبقاتی، صنفی، جنسی اور جسمانی استحصال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور تمام ظلم و جبر کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے۔''

(ایکو فیمزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، نسترن احسن فتیحی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016، ص-17)

مندرجہ بالا اقتباس میں ایکو فیمنزم کے متعلق نسترن احسن فتیحی کا اظہار خیال کافی واضح ہے۔ جب کوئی بھی تحریک/ رجحان/نظریہ سامنے آتا ہے تو کسی ضرورت کے تحت ہی آتا ہے اس لیے اس کی اپنی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ ایکو فیمنزم کی سماجی اور ادبی اہمیت کیا ہے؟ اس پر غور کرنا ضروری ہے کیوں کہ اگر کسی نظریہ کی اہمیت سے واقفیت نہ ہو تو اس نظریہ یا رجحان کا پھلنا پھولنا بھی ممکن نہیں۔ ایکو فیمنزم کو آج کے وقت میں ہم دیکھیں تو یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں لفظ Eco جڑا ہوا ہے اور جس کے تحت صرف عورتوں کی بات نہیں بلکہ فطرت اور ماحولیات کی بات بھی ہوگی۔ ماحولیات کوئی ایسی شئے نہیں ہے جس سے صرف عورتوں کو فائدہ ہو بلکہ یہ تو نسل انسانی کی بقا کا سامان ہے۔ تو اگر کوئی تحریک یا ادبی نظریہ/ رجحان ایسا وجود میں آ گیا ہے جو عورتوں کے حوالے سے ہی اگر ہمارے آلودہ ماحولیات کو سنوارنے کی بات کرے یا کچھ نہیں تو اس کی نشاندہی کرے تو یہ بڑی بات ہے۔ اس وجہ سے اس کی خاص اہمیت ہو جاتی ہے جس کا ہمیں استقبال کرنا چاہیے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ ادب ہمہ وقت کچھ نہ کچھ اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا یہ Process ہی تو ہے جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر ادب میں تبدیلیاں نہ ہوں تو کوئی بھی ادب شاید سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ زمانہ بدلتا ہے، لوگ بدلتے ہیں، لوگوں کی ضروریات، فکر، معاش، سماج، مسائل سبھی کچھ تو بدلتا ہے۔ ایسے میں ادب بھی بدلتا ہے۔ ظاہر ہے آج کے وقت میں حلقۂ ارباب ذوق یا ترقی پسند ادبی تھیوری کو Propagate کریں تو وہ اکثر کے لیے قابل قبول نہیں ہوں گی۔ کسی بھی ادبی نظریہ/ رجحان کے لیے اس کا موزوں وقت بھی ہوتا ہے جو علاقوں کے اعتبار سے الگ الگ ہوتا ہے۔ اس کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب مغرب میں مابعد جدید ادب خلق ہو رہا تھا تب ہم نے

جدیدیت کی ابتدا کی یا پھر ایکوفیمنزم کو ہی لے لیجئے 1970 میں اردو میں اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ 1973 میں ایکو فیمنزم سے متعلق چپکو آندولن ہندوستان میں ہی برپا ہوا۔ مختصر یہ کہ کوئی بھی تحریک ادب میں بھلے ہی وقتی ہو یا دیرپا لیکن وہ ادب کو متاثر ضرور کرتی ہے اور ساتھ ہی اس میں اضافہ بھی۔

Ecofeminism کے مقاصد پر اگر غور کریں تو ہم پائیں گے خالصتاً یہ عورتوں کی حمایتی اور علم بردار تحریک نہیں بلکہ سماجی فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہے اگر اس میں مساویت کا خاص خیال رکھا جائے تو۔ ماحولیات کے متعلق جو Discourse اس میں کھڑے کیے گئے ہیں وہ واقعی وقت کی ضرورت ہیں۔ آج پوری دنیا جس ماحولیاتی آلودگی کی زد میں ہے اس سے سب واقف ہیں۔ آلودگی جو مختلف اقسام کی ہے۔ فضائی/ ہوائی آلودگی، آبی آلودگی، زمینی آلودگی، ریڈیائی آلودگی اور صوتی آلودگی وغیرہ ۔یہ وہ چند خاص آلودگی ہیں جو ہمارے ماحولیات کو بری طرح آلودہ کر رہی ہیں اور طرح طرح کی بیماریاں پھیلا رہی ہیں۔ بڑھتی آبادی نے جنگلوں کو تیزی سے کاٹ کر خطے صاف کیے اور کنکریٹ کے جنگل اونچی عمارتوں کی شکل میں کھڑے کر دیے۔ اس میں عام آدمی سے لے کر بڑے بڑے Capitalist تک سب شامل ہیں۔ پیڑ پودے جو کہ ہوا کو صاف رکھنے کا کام بخوبی انجام دیتے ہیں جب ختم ہونے لگے تو ماحولیات کا توازن بگڑا جس کے نتیجے میں اوزون پرت میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے۔ اُدھر گاڑیوں، فیکٹریوں اور ملوں نے بھی زہریلا دھواں اگلا۔ اوزون پرت جو ہمیں سورج کی UV شعاعوں سے محفوظ رکھتی تھی اب اسے خود ہی حفاظت کی ضرورت ہے۔ زمین کی حرارت بڑھتی گئی اور گلیشیر تیزی سے پگھلنا شروع ہوئے۔ کئی جذیرے جن پر آبادیاں تھیں وہ غرقاب ہوئے اور ان کی آبادیوں کو نقل مکانی کر کے دوسری جگہوں پر پناہ لینی پڑی۔ ابھی بھی بہت سے جذائر خطرے کی زد میں ہیں۔ مثلاً کریباتی اور Solomon کے جذائر وغیرہ۔ ان کے متعلق اخبارات اور Internet پر بہت سی معلومات دی گئی ہیں اس لیے یہاں حوالے سے اجتناب کرتا ہوں۔

آج موسم میں جو گڑبڑیاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ یقیناً فطرت کی چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہی برآمد ہو رہی ہیں۔ انسان نے اپنے لالچ میں جنگلوں کے علاوہ پہاڑوں کو بھی کاٹ کر میدان بنا دیا۔ اس پر منحصر جانوروں اور پیڑ پودوں کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ جس سے Food Chain بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ تفصیل میں جانے کا محل نہیں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ Ecofeminism میں وہ تانیثی لہجہ استعمال کیا جا رہا ہے جو Nature کی حمایت میں ہے۔ اُس سے قریب ہے اور اُس کے لیے ہے۔ اس میں صرف عورتوں کے مسائل نہیں ہیں۔ یہ نظریہ/ رجحان ہی عورتوں کی طرف سے حقوق نسواں کی حمایت، آزادی، ماحولیات سے رغبت، جانوروں سے محبت اور درختوں سے قربت کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ دنیا بھر میں عورتوں نے درختوں، پیڑ پودوں اور ماحولیات سے محبت کا اظہار اپنے اپنے طور پر کیا۔ ہندوستان میں تو بہت سے درختوں کو پوجا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی جگہوں پر شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ایک پیڑ لگاتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اسی ہندوستان میں خاص طور پر خواتین کو پیڑوں میں دیوتا، محبوب، ساتھی اور اپنا بچہ بھی نظر آتا ہے۔ دنیا کی بیشتر شاعری میں محبوب کے چہرے کی مماثلت پھول ہی سے کی گئی ہے۔ پیڑ پودوں کی حمایت میں شروع کیا گیا چپکو موومنٹ اس کی عمدہ مثال ہے۔

اس طرح Ecofeminism ہمارے خود کے لیے، ماحولیات کے لیے اور بعد میں ادب کے لیے بھی مفید ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ صرف عورتوں کی حمایت نہیں بلکہ Humanism کی حمایت نظر آتی ہے۔ اگر اسی مقصد کے تحت اس کو دیکھا جائے تو یہ آگے چل کر اردو میں بھی بڑی تحریک بن کر ابھر سکتی ہے۔ جس سے نہ صرف اردو ادب میں اضافہ ہوگا بلکہ دیگر فوائد بھی ہوں گے۔ جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ Ecofeminism پر اردو میں ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کی کتاب 2016 میں منظر عام پر آئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی دوسرے ملک میں بھی اس موضوع پر اردو میں کتاب آ گئی ہو۔ پھر بھی اس میدان میں ابھی بھی بہت کام ہونا باقی ہے۔ تانیثیت پر اردو میں خاصہ کام کیا گیا ہے لیکن وہاں صرف عورتوں پر ہونے والے جبر و استبداد کی داستانیں اور ان سے متعلق تنقید وجود میں آئی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تانیثیت پر اردو ادب میں خاصی توجہ ابھی بھی دی جا رہی ہے۔ ماحولیات کے متعلق بات کریں تو ہم دیکھیں گے اس میدان میں ابھی بھی بہت کم کام ہوا ہے یہاں تک کہ کسی فن پارے کا ماحولیاتی مطالعہ بھی شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ اس کے پیچھے وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ نام نہاد نقاد ماحولیات کو یا ماحولیاتی تنقید کو ادب کا حصہ ہی نہیں مانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو میں Ecofriendly Literature تخلیق نہیں کیا گیا۔ افسانے اور شاعری دونوں پر ہی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انور قمر، ساجد رشید، نگار عظیم، غزال ضیغم، ترنم ریاض اور انجم قدوائی وغیرہ نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اردو میں غالباً 2000 کے بعد ہی Ecocriticism پر

مضامین لکھے گئے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں بس نسائی فکر اور شامل کردی جائے تو ہم بخوبی سمجھ سکیں گے کہ Ecofeminism کیا ہے۔اس کے سماجی، معاشی، جسمانی، ادبی اور غیر ادبی سروکار کیا ہیں۔ ماحولیاتی تانیثیت اپنے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ادب میں ہی نہیں بلکہ روز مرہ میں بھی سرایت کرگئی ہے۔اسے سمجھنے، اس کے مطابق عمل کرنے اور اسے ادب میں جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب چپکو تحریک میں گاؤں کی عورتیں پیش پیش ہوسکتی ہیں تو پڑھی لکھی عوام کو بھی پیڑ پودوں کو بچانے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ فی الوقت سب سے ضروری بات یہی ہے کہ ہم جس ماحولیات میں سانس لے رہے ہیں، ہمیں اسے محفوظ رکھنے کے بارے میں سوچنا ہے۔اس کے لیے ہم ادب کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی نسائی آواز ایکوفیمنزم کے نام سے بلند ہورہی ہے اور جس کا مقصد معاشرے کی فلاح و بہبود ہے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔

کتابیات/ماخذ

1- ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ -نسترن احسن فتیحی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016

2- بیان کی تلاش (مابعد جدید اور تانیثیت مباحث کے پس منظر میں)- محمود شیخ، خان پرنٹرس، جلپور، 2016

3- فیمنزم (وکی پیڈیا)

4- ایکو فیمنزم (وکی پیڈیا)

5- چپکو موومنٹ (وکی پیڈیا)

□□□

Taouseef Khan

Research Scholar

Dept.of Urdu

AMU Aligarh-202002 (UP)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

محمد اعراج تنویر صدیقی

خواتین کے مسائل اور اخبارات

مواصلاتی ٹکنالوجی نے اس نئے ہزار سالہ میں ایسا انقلاب برپا کیا ہے جس کے نتیجے میں سماج کے ہر شعبہ میں معلومات کی ترسیل سہل ہوگئی ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل فون جیسی جدید ٹکنالوجی کی آمد کے بعد معلومات اور خبروں کے حصول پر اب کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری نہیں رہی ہے۔ اس دور جدید میں طباعتی ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبارات کو آج بھی خبروں کے حصول اور اس کی ترسیل کا ایک فعال اور متحرک ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ اخبارات بھی ایک سعی مسلسل کرتے ہوئے اپنے قارئین کی تعداد کو برقرار رکھنے کے لیے جدید ٹکنالوجی سے استفادہ کررہے ہیں۔ اخبارات روزانہ کی اساس پر سیاست، کھیل کود، ثقافتی وتہذیبی، تفریح وتجارت جیسے متعدد امور کو مطبوعہ مواد کی اشاعت کرتے ہیں۔ باقاعدہ خبروں کے علاوہ، معاشرتی مسائل جیسے تعلیم، سماجی انصاف، خواتین اور بچوں کے امور وغیرہ کو اپنے مطبوعہ مواد کا حصہ بناتے ہیں۔

بیجنگ میں منعقدہ اقوام متحدہ کی چوتھی عالمی کانفرنس برائے خواتین (1995) نے اپنے اعلامیہ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ میڈیا صنفی مساوات کے حصول میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے اور اس میں مزید کہا گیا کہ میڈیا تحقیق، معلومات اور تعلیم کی حکمت عملی کے نفاذ کو فروغ دے تاکہ خواتین و لڑکیوں کے مختلف رول کی متوازن عکاسی کی جاسکے۔ رما جھا (1992) نے اپنی کتاب "ویمن اینڈ دی انڈین پرنٹ میڈیا" میں یہ استدلال پیش کیا کہ صحافتی ذرائع ابلاغ پر مردوں کی اجارہ داری ہے جس کے نتیجے میں خواتین کے حقیقی مسائل کو مناسب کوریج نہیں دیا جاتا ہے اور میڈیا میں خواتین کو مثبت انداز میں پیش نہیں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ خواتین کو درپیش مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے خبروں میں انہیں مناسب جگہ دی جانی چاہیے۔

گرچہ ماضی میں اخبارات کے مشمولات کے تقابلی تجزیے کی متعدد کوششیں کی گئیں لیکن حیدرآباد سے شائع ہونے والی اردو اور انگریزی روزناموں میں خواتین کی خبروں کے مشمولات کے تجزیہ کی یہ ایک منفرد کوشش ہے۔ موجودہ تقابلی مطالعے میں خواتین کے خلاف جرائم سے لے کر صحت اور خواتین کی بااختیاری جیسے تمام امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کس طرح حیدرآباد کے دو قدیم روزنامے دکن کرانیکل اور سیاست خواتین کے مختلف امور پر مبنی خبروں کا احاطہ کرتے ہیں۔ خبروں کے مقداری تجزیہ کے لیے یکم جنوری سے 31 مارچ 2018 تک تین ماہ کی مدت پر مشتمل مواد جمع کیا گیا۔ جس میں ہر چوتھے شمارے سے مطالعہ کے اعداد وشمار جمع کیے گئے۔

اخباروں کا مختصر تعارف: دکن کرانیکل، حیدرآباد کی سرزمین سے مسلسل شائع ہونے والا انگریزی زبان کا سب سے قدیم اور معروف روزنامہ ہے جس کا آغاز راجا گوپال مدلیار نے 1938 میں کیا تھا۔ جبکہ روزنامہ سیاست کی شروعات سقوط حیدرآباد کے ایک سال بعد ہوئی جس کا پہلا شمارہ اخبار کے بانی عابد علی خان کی ادارت میں 15 اگست 1949 کو شائع ہوا تھا۔ سیاست کا شمار ہندوستان کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے چنندہ اردو روزناموں میں ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان کا پہلا اردو

روزنامہ ہے جس کا آن لائن ایڈیشن 1998 میں شروع کیا تھا۔

سلسلہ نشان	اخبارات	جملہ خبروں کا مطبوعہ رقبہ (مربع سنٹی میٹر)	خواتین کی خبروں کا مواد (مربع سنٹی میٹر)	خواتین کی خبروں کا تناسب
1	دکن کرانیکل	258895	2788	07.1
2	سیاست	5.249794	2248	89.0
3	جملہ	5.508689	5036	98.0 (اوسط)

دوران مطالعہ دونوں اخبارات میں خبروں کا جملہ مطبوعہ رقبہ 5.508689 مربع سنٹی میٹر رہا جس میں دکن کرانیکل اور سیاست نے خبری مواد کے لیے بالترتیب 258895 مربع سنٹی میٹر اور 5.249794 مربع سنٹی میٹر جگہ مختص کی ہے۔ جس میں دونوں اخباروں میں خواتین کی خبروں کا مطبوعہ رقبہ صرف 5036 مربع سنٹی میٹر ہی رہا جو کہ جملہ مطبوعہ خبروں کا اوسطاً 98.0 فیصد ہے۔

انگریزی روزنامہ دکن کرانیکل نے خواتین سے متعلق جملہ 38 خبریں شائع کیں جبکہ روزنامہ سیاست میں ان خبروں کی تعداد 30 رہی۔ خواتین کے مسائل سے متعلق خبروں کی جوزمرہ بندی کی گئی ہے اس میں خبروں کی سب سے زیادہ تعداد عصمت دری کے واقعات سے متعلق تھی جو کہ 47.39 فیصد رہی جبکہ جنسی ہراسانی کی خبروں کا فیصد 05.21 رہا۔ تعلیم کے زمرے میں 89.7 فیصد کے تناسب سے تین خبروں کی اشاعت عمل میں آئی جبکہ حقوق نسواں، صنفی تعصب، طلاق ثلاثہ اور وضع حمل و ولادت کی خبروں کا فیصد 63.2 رہا۔ خواتین کی بااختیاری، گھریلو تشدد، انسانی اسمگلنگ اور پولیس مظالم کے زمرے میں دکن کرانیکل نے صرف دو خبریں شائع کیں جبکہ وضع حمل کے دوران ہونے والی اموات سے متعلق کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف اردو روزنامہ سیاست نے مطالعے کے دوران خواتین کے مسائل سے متعلق 30 خبریں شائع کیں جسمیں عصمت ریزی کی خبریں ایک تہائی سے زیادہ رہیں۔ جبکہ جنسی ہراسانی اور حقوق نسواں کا تناسب 10 فیصد رہا جبکہ تعلیم کی خبروں کا تناسب تقریباً 17 فیصد رہا۔ حقوق نسواں اور گھریلو تشدد کی خبروں کو 10 فیصد حصہ ملا جبکہ طلاق ثلاثہ کی خبروں کی تعداد کا فیصد تقریباً 7 رہا۔ وضع حمل اور دوران حمل ہونے والی شرح اموات اور پولیس مظالم کو جملہ خبروں کی تعداد کا 33.3 فیصد حصہ ملا جبکہ انسانی اسمگلنگ کی کوئی بھی خبر سیاست میں دوران مطالعہ شائع نہیں ہوئی۔

اخبارات میں خواتین کی خبروں کے لیے مختص جگہ کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کرانیکل میں خواتین کی جملہ خبروں کا تقریباً 30 فیصد حصہ عصمت ریزی کی خبروں کو حاصل ہوا جبکہ سیاست میں ان خبروں نے 25 فیصد جگہ کا احاطہ کیا ہے۔ جنسی ہراسانی کی خبروں کا مطبوعہ رقبہ دکن کرانیکل اور سیاست میں بالترتیب 55.10 اور 24.18 رہا۔ خواتین سے متعلق تعلیم کی خبروں کو دکن کرانیکل میں 12.11 اور سیاست میں 96.9 جگہ مختص کی گئی وہیں حقوق نسواں کا فیصد دکن کرانیکل اور روزنامہ سیاست میں بالترتیب 74.5 اور 19.12 رہا۔ صنفی تعصب کی خبروں کو دکن کرانیکل نے 6 فیصد جگہ دی اور سیاست میں ان خبروں کو ملنے والی جگہ کا فیصد 19.12 رہا۔ اس طرح طلاق ثلاثہ کی خبروں نے دکن کرانیکل اور سیاست میں بالترتیب 52.5 اور 89.4 فیصد جگہ کا احاطہ کیا جبکہ خواتین کی بااختیاری سے متعلق خبروں کے لیے مختص جگہ کا تناسب دکن کرانیکل میں 89.6 رہا اور سیاست میں 47.3 رہا۔ گھریلو تشدد کی خبروں کا خواتین کی جملہ خبروں کے لیے مختص جگہ کا فیصد دکن کرانیکل میں 10.7 رہا جبکہ سیاست میں یہ 96.9 ہے اسی طرح وضع حمل و ولادت کی خبروں کو دکن کرانیکل میں 16.3 فیصد جگہ ملی اور سیاسات میں 03.7 فیصد جگہ دی گئی۔ دوران حمل اموات کی کوئی خبر دکن کرانیکل میں شائع نہیں ہوئی جبکہ روزنامہ سیاست میں اس مسئلہ کو 03.7 فیصد جگہ دی گئی ہے انسانی اسمگلنگ کی خبروں کو دکن کرانیکل نے 47.9 فیصد جگہ دی گئی جبکہ سیاست میں اس کا فیصد صفر رہا۔ پولیس مظالم پر مبنی خبروں کو مختص جگہ کا فیصد دکن کرانیکل میں 45.4 ہے جبکہ روزنامہ سیاسات میں دوران مطالعہ ان خبروں کا تناسب 24.18 رہا۔

خبروں کے مشمولاتی تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں اخباروں میں خواتین سے متعلق خبروں کا کوریج انتہائی کم ہے جو کہ جملہ مطبوعہ خبری حصہ کا صرف 98.0 فیصد ہے۔ دکن کرانیکل نے صرف 07.1 فیصد جگہ مختص کی ہے جبکہ روزنامہ سیاست نے خواتین کی خبروں کو صرف 89.0 فیصد اشاعتی حصہ دیا ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر معاشرے میں خواتین کی پسماندگی کے پیش نظر بلاشبہ یہ بیحد کم ہے۔ اس کے برعکس اخباروں میں سیاسی خبروں، کاروبار، کھیل کود اور تفریح پر مبنی خبروں کو ترجیح دینے کا رجحان دیکھا گیا اور خواتین سے متعلق خبروں کو یکسر ہی نظر انداز کیا گیا ہے۔

خواتین سے متعلق خبروں کو مختص کی گئی جگہ کا تجزیہ کرنے پر یہ نتیجہ

اخذ کیا گیا کہ مذکورہ دونوں اخبارات نے عصمت ریزی اور جنسی ہراسانی کی خبروں کے لیے زیادہ جگہ وقف کی ہے۔ دکن کے کرانیکل نے عصمت ریزی سے متعلق خبروں کو تقریباً 30 فیصد جگہ مختص کی اور روزنامہ سیاست نے بھی تقریباً 25 فیصد جگہ دی۔ تعلیم، طلاق ثلاثہ اور پولیس مظالم کی خبروں کے لیے مختص جگہ کا تناسب دونوں اخبارات میں تقریباً یکساں رہا لیکن گھریلو تشدد اور حقوق نسواں کی خبروں کو سیاست نے دکن کرانیکل کی بہ نسبت زیادہ جگہ وقف کی۔

ذرائع ابلاغ کا انسانی ذہنوں پر زبردست اثر ہوتا ہے خصوصاً روزنامے اپنی خبروں کے ذریعہ قارئین کو نہ صرف ذوق وتسکین فراہم کرتے ہیں بلکہ ان کے خیالات اور نظریات پر بھی اپنے نقوش چھوڑتے ہیں۔ حیدرآباد کے دو موقر اخباروں کے خبری مواد کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اخبار کا تعلق چاہے کسی بھی زبان سے ہو وہ خواتین سے متعلق خبروں اور ان کے مسائل کو اہمیت نہیں دیتا بجائے اس کے خواتین پر ہونے والے جرائم اور مظالم ہی نمایاں طور پر خبروں کا حصہ بنتے ہیں جبکہ ان کے حقوق، صحت و تعلیم جیسے موضوعات شاذ و نادر ہی اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ اخباروں میں خواتین سے متعلق جرائم اور ان پر ہونے والے مظالم وتشدد کی نمایاں انداز میں اشاعت خواتین کے ذہنوں پر منفی اثرات بھی مرتب کرسکتی ہے۔ مزید برآں اخبارات میں پیش کی گئی خبریں اور مضامین، معاشرے میں مردانہ بالادستی کی بالواسطہ عکاسی کرتی ہیں اور اس نوعیت کی خبریں قارئین کے ذہنوں میں فرسودہ معاشرتی اقدار اور روایتی اصول ورواج کو تقویت دینے کا باعث بنتی ہیں۔

خواتین کے خلاف ہونے والے مظالم کے متعلق شعور بیداری کے لیے کچھ مضامین وغیرہ شامل کیے جائیں تو یہ خواتین کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ چونکہ اخبارات کی اپنی سماجی ذمہ داری بھی ہے جس کے پیش نظر یہ اشد ضروری ہیکہ صرف خواتین کے استحصال اور حق تلفی کی خبروں کی اشاعت کے بجائے اخبارات بالخصوص اردو اخبارات حقوق نسواں، صنفی مساوات کا سطحی تذکرہ کرنے سے پرہیز کرتے ہوئے خواتین کو بااختیار بنانے والے مضامین، ان کے کارناموں اور دیگر مثبت پہلوؤں کو نمایاں طریقے سے اپنے مطبوعہ خبری مواد میں شامل کریں تاکہ یہ خبریں خواتین کے انداز فکر میں مثبت تبدیلی کا ضامن بن سکے۔ جس کے ذریعہ ایک محفوظ و مستحکم معاشرہ کی تشکیل کی راہ ہموار ہوسکے۔

Mohammed Airaj Tanveer Siddiqi
Research Scholar
Dept. of Mass CommunicationJournalism
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad,Telangana, India.
Mob: 8142941432

فردوس احمد بھٹ

نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کا علمبردار

ڈپٹی نذیر احمد

کلونیلزم (Colonialism) جدید تاریخ کی نئی اصطلاح ہے جس کا معروف ترجمہ اردو زبان میں ''نوآبادیات'' کیا جاتا ہے۔ نوآبادیات کی اصطلاح کی وضاحت اور صراحت زیادہ تر انگریزی زبان میں بیان ہوئی ہے۔ اردو میں اس اصطلاح کے مفاہیم زیادہ نہیں ملتے ہیں۔ اردو ادبی اردو لغت میں نوآباد اور نوآبادی کے مطالب اس طرح لکھے گئے ہیں:

نوآباد: (ف۔ص) نیا آباد کیا ہوا۔

نوآبادی: (ا۔مث) وہ بستی جو نئی ہو، محکوم ملک۔

آنیا لومبا (Anai Loomba) نوآبادیات کی تعریف ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''نوآبادیات سے مراد دوسرے لوگوں کی زمین کو فتح کر کے ان کی املاک پر قبضہ کر لینا ہے۔''

(آنیا لومبا، کلونیلزم/پوسٹ کلونیلزم۔ لندن (1998) ص:2)

ایڈورڈ ڈبلیو سعید نوآبادیات اور سامراجیت کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے دونوں کی تعریف اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

'' سامراجیت (Imperialism) کسی دور دراز خطے پر مقتدر کسی غالب میٹروپولیٹن مرکز کے عمل، نظریے اور رویے کا نام ہے جب کہ نوآبادیات (Colonialism) سامراجیت کے نتیجے میں دور دراز خطے پر آبادکاری مسلط کرنے کا عمل ہے۔''

(ناصر عباس نیر، بحوالہ مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں، ص:7)

طاقتور قوموں کا اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے تصرف سے باہر کی زمینوں پر قبضہ کرنا، وہاں کے لوگوں کو غلام بنانا، ظلم، جبر، اور تشدد پر مبنی

توسیع پسند سوچ اور غلبہ پسند خواہش استعمار / نوآبادیات کہلاتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام اس خواہش اور سوچ کی عملی شکل ہے۔ جس میں نوآبادکار محکوم قوم کی سرزمین پر آباد ہو کر ان کے وسائل اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

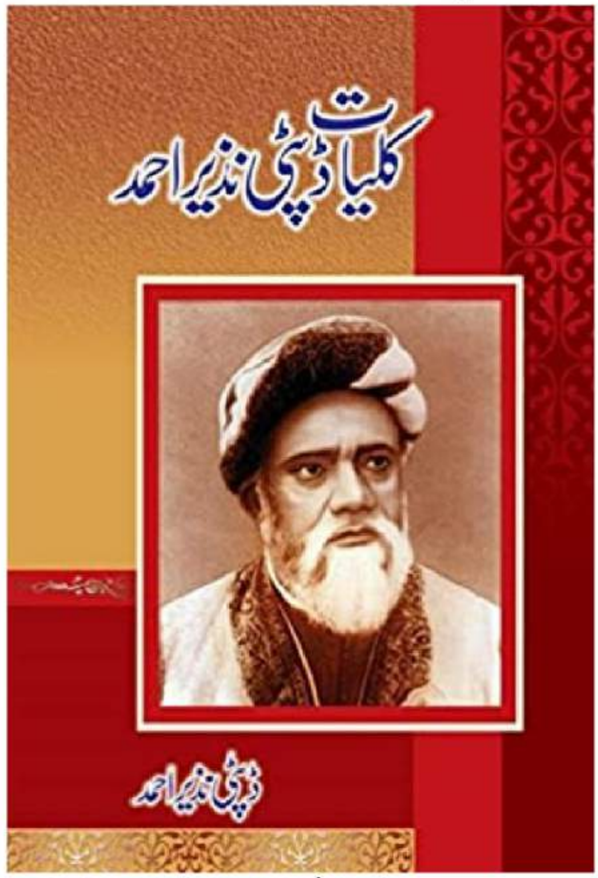

یورپ کے ممالک جغرافیائی اعتبار سے، بہت مضبوط اور طاقتور تھے اور سیاسی لحاظ سے بھی بحری راستوں کا فائدہ اٹھانے لگے۔ یورپیوں نے افریقی ساحلوں اور بندرگاہوں پہ قبضہ کرتے ہی نوآبادیات کا آغاز کر دیا۔ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ اور مشرقی ایشیاء کی طرف پیش قدمی سمندری راستوں کے ذریعے ہوئی۔ ڈچ اور انگریز پرتگال نے سولہویں صدی میں مشرقی اجارہ داری کو چیلنج کر دیا اور پھر ڈچ نے پرتگیزیوں کو بھگا کر 1800 میں جاوا اور سائیلون کا کنٹرول سنبھال لیا۔ وہاں کے جزیرے کے حکمران کو تابع کر لیا اور وہاں پر ہر کسی کے لنگر انداز ہونے پہ پابندی لگا دی۔

نوآبادیات کا مطالعہ اصل میں ان حربوں، تدبیروں اور حکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے بڑے رقبے پہ قبضہ ہوا اور اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان ملکوں کی ثقافت، معاشی ڈھانچے، سیاسی طریقہ کار اور زبان و ادب آزاد ہونے کے باوجود نہ تو اپنی شناخت قائم کر پائے ہیں اور نہ ان اثرات سے نکل پائے ہیں۔ انگریز جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ یہاں کے سیاسی امور میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستان کے قدرتی وسائل اور یہاں کے لوگوں کی سادہ مزاجی دیکھ کر فرنگی کی نیت بدل گئی۔ اپنی سیاسی حکمت عملیوں اور تدبیروں کی وجہ سے وہ ہندوستان میں رہ رہے کروڑوں انسانوں، زمین، جنگلات، پہاڑ وغیرہ کے حکمران بن بیٹھے اور بہت عرصے تک اپنی حکومت ظلم و جبر اور تشدّد کے بل پر قائم رکھی۔ اسی طرح انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو ہندوستان میں مظبوط کیا اور 1857 میں مرکزی سرزمین پہ فتح کا جھنڈا گاڑا۔ انھوں نے نوآبادیاتی کالونیاں بنائیں اور آبائی وطن کے لیے وسیع پیمانے پر اجارہ دارانہ کاروبار کیا۔ ویسے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورے تو سترھویں صدی سے ہی شروع ہو گئے تھے اور اس تجارتی کمپنی نے حکومتی حیثیت تک کا سفر اٹھارویں صدی نصف تک مکمل کیا۔ اس عمل کا باقاعدہ آغاز جنگِ پلاسی سے ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ جو علاقہ بھی فتح کرنا ہوتا سب سے پہلے وہاں کے منتخب افراد سے تعلقات قائم کیے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ افراد اس علاقے میں لوگوں کے اندر اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان افراد کے تعاون سے مقامی آبادی میں موجود حکمران کے خلاف فضا قائم کی جاتی تھی اور مقامی آبادی کی رائے کمپنی کے حق میں لی جاتی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد انیسویں صدی کا نوآبادیات کا زمانہ ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کا مواد اسی نوآبادیاتی عہد کے شمالی ہند کے متوسط معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ انیسویں صدی کا ہندوستان جن سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا اور جس سمت اور رفتار کا حامل تھا اس کے باقاعدہ نقوش ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی بات ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کے تمام کرداروں کے حرکات و سکنات سے حقیقت کی بو آنے لگتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کا دور انیسویں صدی کے نصف دوم پر محیط ہے اور نذیر احمد کے ناولوں کے کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کے مسلم متوسط گھرانوں کے افراد کی نفسیات، ان کے خیالات اور نظریات و رجحانات کی منہ بولتی تصویریں اور اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نوآبادکاروں (فرنگی) کی ترقی اور ان کے علوم سے بڑے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ اہلِ یورپ کی عظمت ان کی سلطنت نہیں بلکہ ان کے جدید علوم قرار دیتے ہیں۔ اور اسی علم کی وجہ سے ان کے قوم کی تقدیر خوشحالی اور ترقی میں بدل گئی۔ صنعتی انقلاب رونما ہونے کی وجہ سے لوگوں

کی روزمرہ کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ڈپٹی نذیر احمد نے خود"ابن الوقت" میں یورپین قوموں کی ترقی کے راز پر روشنی ڈالتے ہوئے نوبل صاحب کی زبانی کہلوایا ہے:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔اوران علوم کے ذریعہ سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر طرح کی کاریگری میں دوسرے ملکوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت اپنے ملک گھسیٹ لے گئے اور گھسیٹے لیے چلے جارہے ہیں۔جس جس طرح کے ہنر اور کمال اہلِ یورپ میں ہیں ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کو سلطنت نہ ہو۔سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں بلکہ روکھن میں ہے اور ان کا حق لازمی ہے"۔

(نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، ص85)

ہندوستان میں استعماریوں یا انگریزوں کی آمد اور انقلاب 1857 کی ناکامی اور اس کے بعد کے حالات نے ہندوستانی معاشرے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔مغربی تہذیب آہستہ آہستہ پورے معاشرے پر اثر انداز ہو رہی تھی۔انگریزوں کے تسلط اور ان کے غلبہ کی وجہ سے بھی شکست خوردہ مسلم اقوام میں پست ہمتی پیدا ہوئی اور نفسیاتی طور پر وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے اور تنزلی کی انتہا کو پہنچ گئے۔جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا زوال ہونا شروع ہوگیا۔زوال آمدہ قوم میں احتجاج اور رد کی صلاحیت دن بدن کمزور پڑتی جاتی ہے اور وہ مغلوب طبقے کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔یہی حال ہندوستان میں مسلمانوں کا بھی ہوا۔مغربی تہذیب کے اثرات سے یہ قوم اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی۔نتیجتاً تہذیب و معاشرت اور مذہب سبھی پر اس کا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اردو ناول کے موجد تسلیم کیے جاتے ہیں۔وہ اردو کے پہلے ناول نگار مانے جاتے ہیں جنھوں نے ناول لکھ کر اردو ناول کی داغ بیل ڈالی۔ان کا سب سے پہلا ناول مراۃ العروس (1869) ہے۔اس ناول پر انھیں استعماری حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا۔اس ناول سے تعلیم و تربیتِ نسواں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔مراۃ العروس میں اصغری بہترین نسوانی رول ماڈل کے طور پر پیش کی گئی ہے اور اس کی خوبیاں اکبری کی خامیوں کے بالمقابل روشن ہوتی ہیں۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس اولین ناول کے دیباچے میں تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کے مفید نتائج کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے ملکہ وکٹوریہ کی مثال کا ایک سے زائد بار حوالہ دیا ہے۔اسی کو بنیاد بنا کر خواتین کی مخفی صلاحیتوں اور امکانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔اس پر مستزاد پبلک انسٹرکشن کے ڈائریکٹر میتھیو کیمپسن نے ناول پر اپنی تقریظ میں اس کے تعلیم و تربیتِ نسواں کی ذیل میں مفید ہونے اور مستقبل میں اس کے مشہور ہونے کی نوید دی ہے۔البتہ یہ پیش نظر رہے کہ اصغری کا باپ اس کی شادی کے موقع پر نصیحت آمیز خط میں عورتوں کی ناقص العقل ہونے کی بات کرتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ناول کا یہ ابتدائی نمونہ سماجی فہم میں آنے والی تبدیلیوں سے ابھرنے والے رجحانات اور ثقافت کے باقی ماندہ عناصر کے درمیان چل رہی کشمکش کی نمائندگی کر رہا تھا۔اگر ایک طرزِ فکر عورت کو ناقص العقل کہتا تھا تو دوسرا اس کی نصف جہاں پر پھیلی سلطنت کو چلانے میں مہارت کا معترف تھا۔

نوآبادیاتی حکومت کے فروغ نے نئی سماجی اور معاشی صورتِ حال پیدا کی۔اس میں قدیم ہنر، جنھیں مغل دربار میں قبولیت اور اعتراف حاصل تھا، ان کی پوچھ گچھ نہ رہی۔شاعری، زبان دانی اور دیسی فنون کی قدر دانی کرنے والے امرا نہ رہے۔ایسے عالم میں بدیسیوں کی پسند کے مطابق خود

کوڈھالنا زندہ رہنے کے لیے لازم ہوگیا تھا۔اس ضمن میں سرکاری تعلیم اور انگریزی پسند طرزِ زندگی کامیابی کے لیے ضروری ہوگئے تھے۔سماج میں درآنے والی تبدیلی کا مطلب تھا مردوں کی دنیا کا بدل جانا۔یوں گھر کے اندر کی دنیا کو بھی تبدیلی کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔دوسری بات یہ کہ لڑکوں کی تربیت گھر میں ہورہی تھی۔یوں باہر کی بدلی ہوئی دنیا سے اگر زنانہ کی مطابقت نہ ہوتو نوخیز کے لیے اس سے مطابقت قائم کرنے میں مشکل ہوسکتی تھی۔اس لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری قرار پایا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں کی عورتیں باکل جاہل ہیں اور اکثر ان پڑھ ہوتی ہیں۔اس لیے اولاد کی تعلیم اچھی نہیں ہوتی۔اولاد ماؤں سے ایام طفولیت میں جس قدر ہلے ملے رہتے ہیں اس قدر کسی سے نہیں رہتے اور جو ماں پڑھی لکھی ہوتی ہے وہ پہلے ہی سے ان لوگوں کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف رجوع کرتی ہے۔یوں مردوں کی آئندہ جدید تربیت کے لیے تعلیم نسواں لازم ہوئی دوسری طرف نوآبادیات کے زیرِ اثر معاشی نظام کے بدلنے سے پیدا ہونے والی غیر یقینی نے بھی اشراف کو مجبور کیا کہ وہ بدلتے حالات کے مطابق خود کو تیار کریں،پھر نوآبادیاتی نظام میں ملازمت کے لیے دور دراز مقامات پر بھی ٹھہرنا پڑسکتا تھا۔جیسے مرأۃ العروس میں اصغری کے والد اور شادی کے بعد اس کا شوہر بھی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم ہوتے ہیں۔ان حالات میں گھر کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری بھی عورت پر رہتی ہے۔اصغری کا کردار اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اصغری کی صفات اور طرز عمل پر غور کرنے سے ان توقعات اور مقاصد کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے جن سے اس کردار نے جنم لیا۔دوسری بات اس کردار کو ناول کے پورے تناظر میں رکھ کر دیکھنا اور اس دور میں عورت کے بارے میں موجود تصورات کے سیاق میں اس کی تفہیم سے کئی نئے زاویے سامنے آسکتے ہیں۔اوپر مذکور خط میں اصغری کے والد اسے نصیحت کرتے ہوئے اس مردانہ طرزِ فکر کے بنیادی خدوخال وضع کرتا ہے جس میں اصغری کی تشکیل ہوئی ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ حوا کو آدم کی خوشنودی کے لیے پیدا کیا گیا۔

”عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا اور
عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔“

(نذیر احمد،مراۃ العروس۔ص86)

وہ عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے دو سبب بیان کرتا ہے،جسمانی طاقت اور عقل۔وہ عورتوں کی ان ڈینگوں کو بھی ناپسند کرتا ہے جس میں مردوں کو زیر بار رکھنے یا نخروں کے ذریعے مطیع کرنے پر فخر کرتی ہیں۔اس کی دانست میں بیوی کو شوہر سے محبت کے ساتھ ساتھ اس کا ادب بھی کرنا چاہیے۔وہ ایسی رسموں کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے جن سے مردوں پر عورت کی برتری قائم ہوتی ہو۔اس کی نصیحت کا مرکز یہ ہے کہ اصغری شوہر کو ہر طرح سے خوش رکھے،اتفاق اور صلح کاری،خانہ داری میں خوشی کے لیے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور شوہر کا دل فرماں برداری سے راضی کیا جاسکتا ہے۔ان نصیحتوں کی مدد سے مطلوب تعلیم وتربیت کے اشارے مل جاتے ہیں۔یہیں عورت پر بطور صنف بھی کچھ صفات کا تعین ہوتا ہے۔اصغری کے کردار میں انہی خوبیوں کی جھلک ملتی ہے اس ایک فرق کے ساتھ کہ وہ عقل کی مدد سے گھر بھر کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔اس میں انتظام و انصرام کی صلاحیت کو تقویت اور دلیل ملکہ وکٹوریا کے کردار سے ملتی ہے۔اس طرح ناقص العقل ہونے کے باوصف اس کی تدبیر اور حسن انتظام کی خوبیاں ان میں موجود ہوتی ہیں۔تاہم یہ سمجھنا چاہیے کہ اصغری کی تمام خوبیوں کا مرکز اس کے شوہر کی ذات اور اس کا گھرانہ ہے۔وہ گھر میں ایک مدرسہ کھولتی ہے،جس کی تقریب کچھ اس طرح بنتی ہے کہ برادری کی ایک پھوہڑ رئیس زادی حسن آرا کو اصغری کی سلیقہ شعاری کا شہرہ سن کر اس کے پاس تربیت کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔اصغری اس ایک شاگردہ کے ساتھ اپنی نند محمودہ کو بھی تربیت دیتی ہے،جس کی خبر پاکر محلے سے اور لوگ بھی اپنی بچیاں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔اصغری تربیت کے شوق میں آنے والی ہر طالبہ کو اپنے مکتب میں جگہ نہیں دیتی۔وہ شاگردوں کے انتخاب میں نسلی شرف کو معیار بناتی ہے۔

”حسن آرا کے بیٹھتے ہی محلے کا محلّہ ٹوٹ پڑا۔جس کو دیکھو اپنی
لڑکی کو لیے چلا آتا ہے اصغری نے شریف زادیوں کو چن لیا
اور باقیوں کو حکمت سے ٹال دیا۔“(ایضاً،ص155)

اصغری کے اس عمل اور بچیوں کی تعلیم گھر پر دینے سے کم از کم ایک بات صاف ہوجاتی ہے۔تعلیم وتربیت کا یہ منصوبہ اپنے اندر طبقاتی امتیاز رکھتا تھا۔اصغری کے مکتب میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اشراف زادیوں کو گھر میں درپیش ممکنہ مسائل اور صورتحال کے لیے تیار کرنے کا مقصد لیے ہوئے ہے۔قرآن،ابتدائی حساب،لکھنا،پکانا اور سینا پرونا یہ وہ نصاب ہے جس کی اصغری کے گھر پر تعلیم ہوتی ہے۔ان قابلیتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نصاب گھر کی چار دیواری کے اندر خانگی زندگی کو زیادہ باسہولت اور کامیاب بنانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سے عورتوں کے رول کا تعین بھی ہورہا ہے۔

نوآبادیات کے زیر اثر پروان چڑھنے والا یہ تعلیمی منصوبہ ہندوستانی تہذیب کے زبانی پن سے خواندگی کی طرف سفر کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ ہندوستانی تہذیب زبانی روایت سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں آمیخت ہونے والی مسلم روایت میں بھی کتاب کی بنیادی اہمیت کے باوصف زبانی پن کا کردار مسلمہ ہے۔ خود قرآن کو کتابی صورت بھی زبانی روایتوں سے سند لے کر دی گئی۔ زبانی روایت میں راوی کی حیثیت اساسی ہوتی ہے۔ اس کا استناد اس کی سماجی حیثیت، کردار اور تجربے سے قائم ہوتا ہے۔ دوسری بات زبانی روایت میں رواج بھی بطور سند استعمال ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کی تبدیلیوں نے اس روایت کے استناد پر سوال اٹھانے کے لیے جو استدلال استعمال کیا وہ منطق سے زیادہ محکم حیثیت کو استعمال کرتا ہے۔ زبانی پن میں راوی یا رواج کو جو استناد حاصل تھا، وہ مقام اب مطبوعہ کتاب اور رسمی تعلیم کو حاصل ہوا۔ جس طرح رواج کسی رسم یا طور کے مستند ہونے کی علامت نہیں اسی طرح کوئی مطبوعہ کتاب یا کسی رسمی تعلیم کے ذریعے حاصل کردہ ڈگری بھی علم کا معیار نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر ناول نگار کے زاویہ نظر اور کرداروں کی پیش کش پر نظر رکھی جائے تو کچھ ایسی ہی صورت برآمد ہوتی ہے۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ علم اور عقل کا تعین کرنے میں ہندوستانی آزاد نہیں رہے۔ یہ زمام اب انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی یہ طے کر رہے ہیں کہ علم کیا ہے۔ دوسری بات ان کی مقتدر حیثیت انھیں یہ موقع فراہم کر رہی ہے۔ نتیجہ اب وہی سرگرمیاں لائق تحسین ہیں جن کو وہ خوب قرار دے رہے ہیں۔ وہ کام جو انگلستانی لڑکیاں کرتی ہیں وہی اگر ہندوستانی کریں تو وہ بھی تعلیم یافتہ اور عاقل کہلائیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بعض مقامات پر مختلف علوم اور جغرافیے کا علم بھی بذریعہ قصہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ناولوں میں تعلیم کی ضرورت کے بارے میں پیش کیے گئے خیالات اور غیر رسمی نصاب پر نظر ڈالیں تو ایک نکتہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم، علم کی تخلیق، جاننے کے ذوق اور دریافت کے شوق کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ چند ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے سو اس میں افادی نقطۂ نظر غالب ہے۔ یہ چند ہنر مندیوں کو سکھانے کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کا مقصد انسان کے ذوقِ جستجو کو جلا بخشنا یا شوقِ تحقیق کی آبیاری کرنا نہیں ہے۔ اس لیے تعلیم ایک محدود دائرہ کار کی حامل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تعلیم گھر پر ہو رہی ہے۔ یہاں عورت کا ایک نیا روپ سامنے آرہا ہے جس میں گھر ساز اور تربیت کار ہے۔ اسے ایسے ہنر سکھائے جا رہے ہیں جن سے گھر داری میں حسن سلیقہ در آئے اور نوآبادیاتی صورت حال سے پیدا ہونے والی ضرورتیں بھی پوری ہوں۔ یہ بات صاف ہے کہ تعلیم نسواں، مردانہ ضرورتوں کے تابع تھی اور بڑی حد تک آج بھی ہے۔

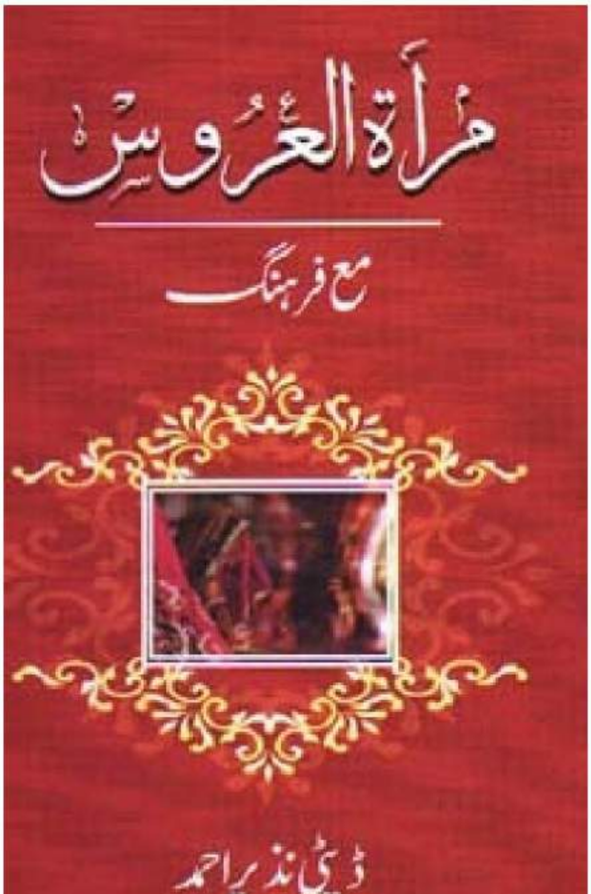

ڈپٹی نذیر احمد سخت گیر مولوی تھے۔ وہ مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن اس میں بے جا قدامت پرستی اور نری مولویت سے انھیں نفرت تھی۔ وہ صرف مدرسے کی تعلیم کو انسان کے لیے نامکمل سمجھتے تھے۔ وہ مغربی علوم و افکار کو مسلمانوں کے لیے اہم سمجھتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''گورمنٹ کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جس میں تعلیم سے زیادہ تربیت شامل ہو۔ اور بی اے اور ایم اے کی جگہ یا اس کے بعد انجینئری، ڈاکٹری، ایگریکلچر، باٹنی، طبیعات، جیالوجی جن کے ذریعے سے صنعت اور دست کاری اور ایجاد کی قدرت حاصل ہوتی ہے سکھائی جائے۔ ہندوستان میں یورپ کی طرح صنعت وحرفت کے اسکول کھول دئے جائیں

اور جتنی ضرورت کی اشیاء باہر سے آتی ہیں وہ ہمارے ملک میں تیار ہوں۔'' (افتخار عالم بلگرامی، حیات النذیر۔ ص139)

لہٰذا وہ ایسی تعلیم کے حمایتی تھے جس کے حاصل کر لینے کے بعد فارغ طالب علم ملک، قوم اور معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکے۔

ناول مراۃ العروس میں دراصل اکبری کا کردار مشرقی نظم حیات کا پروردہ ہے۔ اس کے برعکس اصغری اچھی تربیت وتعلیم اور پڑھ لکھ کر صرف اپنے سلیقہ سے گھر کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ گھر کا ماحول درست کرنے کے علاوہ اصغری کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بے کار اور قدرے آزاد مزاج شوہر کو انگریزی نوکری دلوادی۔

''اصغری: انگریزی نوکری تلاش کرو۔

محمد کامل: انگریزی نوکری تو بے سعی وسفارش کے نہیں ملتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مجھ سے بہتر بہتر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

اصغری: جو لوگ نوکری پیشہ ہیں ان سے ملاقات پیدا کرو۔ ان سے محبت بڑھاؤ۔ ان کے ذریعے سے تم کو نوکری کی خبر لگتی رہے گی اور ان ہی کے ذریعے سے تم کسی حاکم تک بھی پہنچ جاؤ گے۔''

(نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس۔ ص123)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے جلو میں ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا تھا۔ قدیم جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور استعماری نظام آہستہ آہستہ اپنی ایجادات واختراعات کے ذریعے ہندوستانی زندگی پر قابض ہوتا جارہا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت سے متاثر و مرعوب تھے۔ وہ ان حالات کے اسباب دریافت کرتے ہوئے انگریزی علوم کے سبب انگریزوں کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے ہندوستانیوں پر انگریز قابض ہیں۔۔۔ سب کے سب پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور اسی سے خدا نے ان کو یہ ترقی دی ہے کہ کہاں ان کی ولایت اور کہاں ہندوستان۔۔۔ مگر علم کے زور سے اس ملک میں آئے۔ علم کے زور سے سلطنت کی اور علم ہی کے زور سے اس کو اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ چلا رہیں کہ روئے زمین کی کسی سلطنت میں ایسا امن وانصاف اور ایسا نظام نہیں۔'' (نذیر احمد، مراۃ العروس۔ ص20)

اس طرح وہ نہ صرف انگریزی عملداری کو سب سے بہتر و برتر حکومت تسلیم کرتے ہیں بلکہ خود کو استعمار زدہ مانتے ہیں۔ ان کو اپنا آقا اور حاکم تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا غلام بھی قرار دیتے ہیں:

''صاحب نے پوچھا: کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی میری کچہری میں تھا؟

مولوی صاحب نے کہا: محمد کامل''

صاحب نے کہا: ''وہ تو ہمارے ساتھ آیا ہے۔ وہ آپ کا بیٹا ہے؟''

مولوی صاحب نے کہا: آپ کا غلام ہے''۔ (ایضاً، ص193)

مولوی فاضل اور جیمس صاحب کی اس گفتگو سے محکوم طبقہ کی ذہنیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا سیاسی جبر محکوم طبقے پر اس درجہ مسلط ہوا کہ وہ اپنی شناخت کو مٹا کر خود کو اس کا تابعدار تسلیم کرتا ہے۔ لیکن کسی حکومت کے دست نگر رہنا الگ بات ہے اور غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھانا جدا حقیقت ہے۔ اور یہی نوآبادیاتی نظام کی برکات وثمرات کا ایک نتیجہ ہے۔ اس طرح نذیر احمد انگریزی تہذیب ومعاشرت کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ لہٰذا مغرب کی بے پردہ عورتوں کو مشرق کی باپردہ خواتین کے مقابلے میں حیا اور شرم کا پیکر قرار دیتے ہیں۔ دراصل اس ناول میں کوئی بھی واقعہ محض واقعہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کے ذریعے وہ فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مشرق کا ہر فرد جاہل، بدطینت اور بدتہذیب ثابت کیا جا سکے۔ چونکہ نوآبادیاتی نظام نے حاکم ومحکوم طبقے میں یہ حد فاضل قائم کی کہ ہندوستانی توہم پرست، غیر مہذب، ناشائستہ، جاہل اور کٹھ حجت قوم ہے۔ اس کے برعکس انگریز تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، باسلیقہ، عقلمند اور ترقی یافتہ قوم ہے۔ لہٰذا ڈپٹی نذیر احمد اور بشمول دوسرے اصلاح قوم نے اس تفریق کے تناظر میں محکوم طبقہ کی تعلیم واخلاق کی اصلاح کا کام انجام دیا اور عہد نو کے تقاضوں اور اخلاقی ومعاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے علوم جدیدہ پر زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ

''علم وہنر حاصل کریں جس سے دنیا وعاقبت دونوں درست ہوں۔'' (نذیر احمد، ڈپٹی، بنات النعش۔ ص30)

یہاں علم وہنر سے مراد مشرقی علوم نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ:

''علم ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا ہے اور جو ہے وہ جہل سے بدتر ناحق کی کٹھ حجتی اور جھوٹی شاعری کے سوائے ہندوستان میں کچھ اور بھی نہیں۔'' (ایضاً، ص120)

وہ مشرقی علوم کو مسترد کرتے ہوئے علم کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں:

''علم وہ باتیں ہیں جو کتابوں میں لکھی ہیں۔حساب،جغرافیہ ،تاریخ ،طبیعات ،طب ،صرف ونحو ،منطق ،ہندسہ ،ریاضی وغیرہ۔تمام تر علموں کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی چیز جو دیکھو اس کی حقیقت اور کوئی بات جو سنو اس کی وجہ سوچنی چاہیے۔''

(ایضاً،ص106-07)

اس طرح نذیر احمد انگریزی علوم کی نشر و اشاعت کے ذریعے سائنسی فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان کے مطابق علم عقل کی غذا ہے اور علم سے مراد ہیں سائنسی علوم جسے وہ دین و دنیا کی درستگی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔اس لیے کہ قدیم علوم غیر افادی ہیں اور اس کے مقابل انگریزی علوم مفید و بکار آمد ہیں۔یہی وہ مفید علوم ہیں جن سے صنعتی انقلاب آیا ہے اور انسان کی روزمرہ کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوگئی۔وہ لکھتے ہیں:

''جو علم بکار آمد ہیں انگریز سب سے زیادہ جانتے ہیں اسی علم کے زور سے وہ نادر کلیں ایجاد کی ہیں اور آئے دن ہوتی چلی جاتی ہیں کہ سن کر عقل دنگ ہوتی ہے۔دنیا کا تمام کام کلوں سے لیا جاتا ہے۔کلیں سوت کاتیں۔کلیں کپڑے بنیں اور کلیں آٹا پیسیں ،کلیں کتابیں چھاپیں ،کلیں باجے بجائیں ،کلیں لوہار بڑھئی کا کام دیں بلکہ کلیں وہ کام کریں جو آدمی سے نہ ہو سکے۔''(ایضاً،ص130)

ڈپٹی نذیر احمد نہ صرف انگریز قوم اور انگریزی علوم کے دلدادہ تھے بلکہ ان کو تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ دانش مند،مہذب اور شائستہ قوم قرار دیتے ہیں۔لہٰذا اس قوم کی طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے ایک انگریز خاندان کے حالات ہندوستانیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں کیونکہ نذیر احمد چاہتے تھے کہ اس طرز حیات کی تقلید و پیروی کی جائے یا اسے اپنا آئیڈیل بنایا جا سکے۔اس ضمن میں ہندوستانی معاشرے میں مسلمان عورتیں اظہار رائے کی آزادی ،خلع کا حق اور عقد ثانی وغیرہ ان تمام حقوق سے محروم قرار دیتے ہوئے اس نظام حیات پر جابجا تنقید کی ہے۔مثلاً انگریز خاتون کے ذریعے مغربی طرز حیات کے مقابل مسلمانوں کے طرز معاشرت پر اعتراض کرتے ہیں کہ:

''ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضامندی سے ہوتی ہے۔میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضامندی آپ لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھتی ہوں کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔''(ایضاً،ص135)

نوآبادیاتی نظام میں استعمار زدہ یا محکوم طبقے کا اپنے آقاؤں سے مطابقت و مناسبت اختیار کرنا ضروری تھا لہٰذا اس طبقے کی اصلاح کے لیے معیاری نمونہ اپنے حاکموں کا طرز حیات تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کے بتائے ہوئے طرز حیات کے مطابق اپنے معاشرے میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہو یا آزادیٔ نسواں کا،اچھی بیوی کی صفات یا بچوں کی عمدہ تربیت کا،انتظام و انصرام کی عمدگی کا ہر جگہ نوآبادکار یا حاکم طبقے کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اس پورے جائزے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد تعلیم نسواں کو فروغ دینے اور اس کی اہمیت کو سماج میں بیدار کرنے کی جدوجہد میں تھے۔جس کی وجہ سے وہ ایک علمبردار کی حیثیت رکھتا ہے۔انھوں نے طبقۂ نسواں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے پر بہت زور دیا ہے۔اس مطالعہ سے یہ نتائج اخذ کیے جاتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نوآبادیاتی دور کی مسلمان عورتوں کی حالت سدھارنے کی تگ و دو میں مصروف عمل تھے۔ان کو جدید اور مفید علوم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔جو قوم کی ترقی اور خوشحال کی زندگی بسر کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔وہ اپنے قوم کی مستورات کو روشن خیال اور تعلیم یافتہ دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔یہ ان کی زندگی کا اولین مقصد تھا کیونکہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ناول نگاری کی ابتدا تعلیم ہی کے موضوع سے کی ہے۔انھوں نے معاشرے میں پھیلے مختلف اقسام کی برائیوں کا علاج اپنے ناولوں میں تحریر کردیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد تعلیم نسواں اور اولاد کی اچھی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گھریلو نظام کی درستگی عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اچھی تربیت سے گھر کی خوشحالی اور زندگی کامیاب ہوجاتی ہے۔میں ڈپٹی نذیر احمد کے قول پر اپنے مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خواتین کی تعلیم اور بچوں کی تربیت کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔وہ لکھتے ہیں:

''مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا۔''(مراۃ العروس،ص22)

□□□

Firdous Ahmad Bhat
Research Scholar
Deptt. of Urdu
University of Kashmir
Srinagar--90006 (J& K)

شازیہ بانو

جدید غزل اور عشق کا بدلتا تصور

غزل اردو شاعری کی ایک مقبول ترین صنف ہے۔ جس کے لغوی معنی عورتوں سے عشق ومحبت کی باتیں کرنا ہے۔ مگر صنف غزل اپنے لغوی معنی تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس نے مسائل حیات کے بیشتر موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی جو اس کی مقبولیت کا اہم سبب بنا۔ البتہ مرکزیت حسن وعشق اور اس کے متعلقات کو ہی حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے تقریباً تمام شاعروں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی اور اسے منفرد انداز سے پیش کیا۔ کسی نے عشق کو کل کائنات قرار دیا تو کسی نے تسخیر کائنات کا راز بتایا۔ مثلاً:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میر تقی میر

داغ الفت ہر ایک دل میں ہے
عشق انسان کی آب وگل میں ہے

مرزا شوق لکھنوی

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

فراق گورکھپوری

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

غالب

عشق کے مضراب سے ہے نغمہ تار حیات
عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

علامہ اقبال

عشق کرنا جو سیکھا تو دنیا برتنے کا فن آ گیا
کاروبار جنوں آ گیا ہے تو کار جہاں آئے ہیں

اطہر نفیس

عشق جیسے خوبصورت احساس کی ہر عہد میں مختلف انداز سے عکاسی کی گئی۔ کلاسیکی غزل کا مطالعہ کریں تو وہاں عشقیہ شاعری کا بیشتر حصہ حقیقی اور انفرادی تجربے کے بجائے عشق کے تخیلی وعمومی تصورات پر مبنی نظر آئے گا۔ مگر رفتہ رفتہ حسن وعشق کے روایتی قصے میں تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں اور فراق کے عہد تک آتے آتے صنف غزل فرد کے انفرادی جذبات واحساسات کا وسیلۂ اظہار بن گئی۔ بقول فراق گورکھپوری:

''غزل اب پنچایتی چیز نہیں رہی وہ دن بدن انفرادی ذہنیت وشخصیت کے اظہار کا پردہ ساز بنتی جا رہی ہے''

(اردو کی عشقیہ شاعری 1966 ص نمبر 71)

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ صنف غزل میں حسن وعشق کے

موضوع کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے، مگر جدید دور میں اس کی مرکزیت اور اولیت قائم نہیں رہی، اور نہ ہی اس میں وہ روحانیت اور ماورائیت باقی رہی جو قدیم غزل کی خصوصیت تھی۔ جدید عہد میں زندگی کے نت نئے چیلنجز نے حسن ومحبت اور عشق و عاشقی کے داستانی خیالات کو غلط ثابت کردیا۔ آج کا عاشق اپنی انا اور وجود کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ ایک قسم کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے، جس نے اس کے لیے عشق کی شیرینی کو تلخ اور بدمزہ بنا دیا ہے۔ اب عشق اس کی زندگی کا صرف ایک جزو ہے اس کی پوری کائنات نہیں ہے۔ جدید عہد کا عشق تجرباتی قسم کا ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں ہی عشق کے مکمل تابع نہیں ہونا چاہتے ہیں۔ حسن وعشق کے ان بدلتے تصورات سے جدید غزل نئی جہتوں سے روشناس ہوئی۔ جیسا کہ شمیم حنفی جدید دور کے عشق کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''اس کی حیثیت نئی غزل میں زندگی کے ایک عام لیکن توانا اور مستحکم جذبے کی ہے جو تمام مسائل کے ہجوم میں خود کو متحرک رکھتا ہے۔ اور اس کی تصویریں عشق کے مثالی یا سماجی تصور کی روایت سے نہیں ابھرتیں بلکہ روزمرہ زندگی کے ایک جیتے جاگتے خون کی حرارت سے معمور تجربے کی بنیاد پر مترتب ہوتی ہیں۔ یہ زندگی کا بس ایک پہلو ہے۔ مکمل زندگی یا اس کا اشاریہ نہیں ہے، اس لیے نئی غزل کے عشقیہ حصے میں بے چارگی، خودترحمی، بے زاری، گریہ وبکا اور شکوہ شکائیت کا کوئی انداز نہیں ملتا''

(غزل کا نیا منظر نامہ، تاج آفسیٹ پریس، الہ آباد 1981، ص نمبر 61)

عشق کے رویے میں یہ تبدیلی دراصل انسانی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ جدید دور بے کلچری اقدار کی شکست وریخت کا عہد ہے تو بھلا عشق جیسے انسانی جذبے کی پرانی معنویت کیسے برقرار رہ سکتی تھی۔ اب عشق، عاشق ومعشوق اور رقیب کے مثلث سے باہر آگیا ہے اور حسن وعشق کا نیا خاکہ ابھر کر سامنے آیا۔ اب عاشق عشق میں ناکامی کی صورت میں نالہ وفریاد کرنے کے بجائے اپنی الگ راہ وضع کرلیتا ہے۔ اپنے محبوب کو کسی دوسرے کے ساتھ بھی دیکھتا ہے تو اس کو تکلیف نہیں ہوتی، یہاں تک وہ خود ایک انسان سے عشق کرکے اکتا جاتا ہے اور دوسرے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ اب تو نہ پہلے جیسے اصول وقواعد ہیں نہ شرائط اور پابندیاں۔ آج کا برق رفتار عہد عشق میں خودسپردگی کی اجازت نہیں دیتا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے روایتی عشق کی زوال پذیری اور بے معنویت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ کیا کہ اک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ناصر کاظمی

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمھیں بھلا دیتے
خلیل الرحمان اعظمی

زمانے کو پہلی سی فطرت نہیں ہے
محبت بقدر محبت نہیں ہے
شکیب جلالی

جو ہو ایک بار وہ ہر بار ہو، ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا
ندا فاضلی

یہ زندگی عجیب ہے اب تجھ سے کیا کہیں
سچ ہے ترا خیال کبھی تھا، کبھی نہیں
شاذ تمکنت

تری تلاش تو کیا تیری آس بھی نہ رہے
عجب نہیں کسی دن یہ پیاس بھی نہ رہے
شہزاد احمد

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی کے ساتھ ہے
میرا اس کا سمجھوتا ہے کون بڑھائے بات کو
ساقی فاروقی

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ فضا یہ رات
اس نے کہا یہ میری پڑھائی کا وقت ہے
احمد مشتاق

میں تیرے کمرے میں تھا
تو کس کے کمرے میں تھی
عادل منصوری

کلاسیکی غزل میں محبوب کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حسن و جمال اور ناز وادا کا ایسا مجسمہ ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں، وہ لالہ رخ، گل بدن، سروقد، نازک بدن، سیم بر، ماہ پیکر ہے۔ کبھی اس کے لب کو پنکھڑی سے تو کبھی قد کو سرو اور چہرہ کو مہتاب سے تشبیہ دے کر اس کو بے مثال ثابت کیا جاتا ہے۔ جدید غزل میں یہ رویہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ آج

کا محبوب گوشت پوست کا بنا عام سا فرد ہے ۔ جو معمولی خدوخال کا بھی ہوسکتا ہے اور خوبصورت شکل وصورت والا بھی۔

کوئی یونہی سا تھا جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی ماہ کا ٹکڑا نہ کوئی زہرہ جبیں

فراق گورکھپوری

نبھا رہا ہے یہی وصفِ دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

احمد فراز

سانولا رنگ وہ تیکھے سے خدوخال اس کے
تبھی ہی تو گرویدہ ہوئے ہیں قمر اقبال اس کے

قمر اقبال

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورت جاناں دکھائی دے

شہریار

جدید عہد میں ''عشق بن یہ ادب نہیں آتا'' اور'' میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا'' جیسے تصورات معدوم ہو چکے ہیں۔ اب محبوب سے ملاقات کے لیے نہ تو ذلیل وخوار ہونا پڑتا ہے اور نہ ہی اپنے جذبات کی رسائی کے لیے کسی قاصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جدید غزل میں کوچہ یار، نامہ بر اور رقیب جیسی اصطلاحات نظر نہیں آتیں ۔ اب محبوب سے ملاقات بآسانی ہوجاتی ہے کبھی بس اسٹاپ پر تو کبھی دوکان پر، کبھی پارک میں تو کبھی عام شاہراہ پر۔

رومال پر تھے پھول کڑھے پات شال پر
دیکھا تھا میں نے کل اسے بک سٹال پر

ناصر شہزاد

وہ دیکھتی رہی مڑ مڑ کے آئینے سے مجھے
سڑک پہ چلتی ہوئی بس دھواں اگلتی رہی

ناصر شہزاد

دیکھا تھا ظفر جس کو ابھی شہر کے پل پہ
روشن ہے وہی شمع کتابوں کی دکاں میں

ظفر اقبال

سلیم احمد جدید محبوب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس محبوب کی صفت صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی ہے بلکہ اسے دیکھنے کی صفت بھی لائی جاسکتی ہے، صرف دیکھنے کی نہیں، ساتھ سلانے کی بھی۔ اس کے حسن کی وہ ساری ماورائیت ختم ہوگئی ہے، جو اس کا سلسلہ کسی حسن ازل سے ملا دیتی تھی ..... اور ایک تبدیلی یہ بھی ہے کہ اس سے ملاقات کے لیے مستقل کوئے رقیباں یا بالائے بام کی شرط نہیں رہی۔ اب وہ سڑکوں پر، مکانوں کے زینوں پر، پائیں باغ کے کونوں میں، بازار کے چوراہوں اور بک سٹالوں پر ملنے لگا ہے''۔

(رسالہ فنون، جدید غزل نمبر، جنوری 1969ء ص نمبر 42)

جدید غزل میں عشق کی تمام کیفیات موجود ہے۔ مگر اب ان کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اب صرف عاشق کو ہی انتظار کی اذیت برداشت کرنی نہیں ہوتی ہے، بلکہ محبوب بھی اس میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ عاشق کبھی محبوب کی جدائی کو برداشت کرلیتا ہے تو کبھی محبوب کی بھولی بسری یادوں کے سہارے اپنی زندگی کو منظم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ خود اپنے تعلقات کو ہنسی کا موضوع بناتا ہے تو کبھی کھوکھلے اور رسمی عشق سے عاجز آکر سچی اور مخلص محبت کا سوال کرتا ہے۔ دراصل حسن وعشق کے یہ بدلتے معیار انسانی جذبات واحساسات کے نشیب وفراز سے متعلق ہے۔ یہاں ہجر بھی ہے وصال بھی اور عشق کا احساس بھی۔ نہ صرف یہاں جسمانی لذت ہے، نہ مجرد احساس، بلکہ یہاں حقیقی انسان کی تصویر کشی ہے جہاں محبت بھی ہے اور انسانی تقاضے بھی جدید غزل کی اہم پہچان ارضیت اور واقعیت ہے۔

بہت دنوں پہ کھلا عشق خود غرض کا راز
کہ اس طرف بھی شبِ انتظار گزری ہے

فرید جاوید

کل میں نے اس کو دیکھا تو دیکھا نہیں گیا
مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی بہت غم سے چور تھا

منیر نیازی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر کاظمی

ایک دو پل ہی رہے گا سب چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

خلیل الرحمٰن اعظمی

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا

محمد علوی

جیسا کہ فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''نئی غزل میں محبت اور معاملات محبت نفسیاتی اور جسمانی واردات ہیں۔ یہاں شدت جذبات سے جسم پگھل بھی سکتے ہیں اور حالات کی برف پگھلتے ہوئے جسم کو منجمد بھی کر سکتی ہے یہاں یادیں بھی ہیں اور باتیں بھی، وصال بھی ہے اور ہجر بھی ،لیکن سب کچھ وہی ہے جسے نئے شاعروں نے خود محسوس کیا ہے۔''

(چٹان اور پانی، نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد 1947 ص نمبر 96)

جنسی حقیقت نگاری جدید غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ جدید شعراء نے روایتی عشق و محبت کے تقدس سے انحراف کا رویہ اپنا کر جنسی کیفیات کو بے باکی سے بیان کیا ہے۔

''ان کے لیے جنسی نفسیات لذت کوشی کا نہیں ہے بلکہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعہ بن چکی ہے چنانچہ حقیقت نگاری کے نام سے تمام پردے اٹھا کر عورت کو بے پردہ کر دیا ہے۔ جنسی جذبات کا اظہار اس قدر بے باک ہو گیا ہے کہ وہ محبوب سے اپنے خلوص کے ساتھ اس کے جسم کا مطالبہ کرتا ہے''

(نئی غزل اور عشقیہ شاعری، ڈاکٹر علی احمد جلیلی 2004، ص نمبر 79)

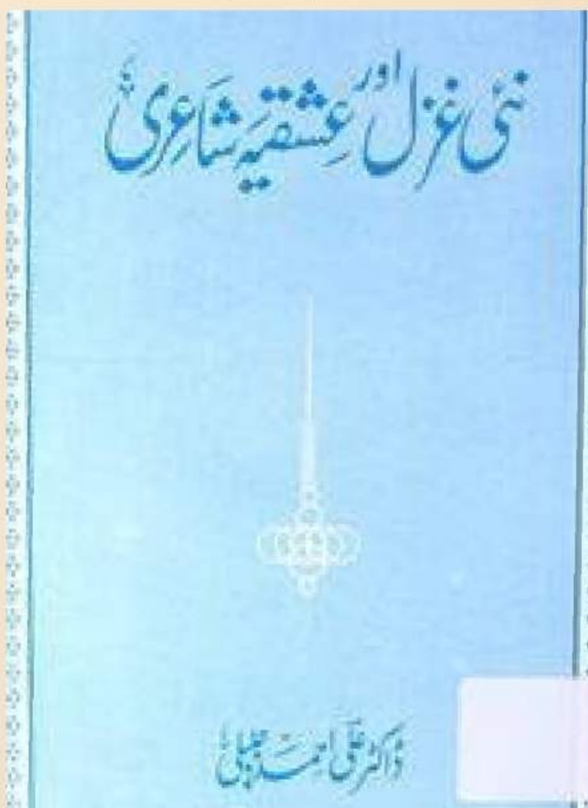

راستہ دے کہ محبت میں بدن شامل ہے
میں فقط روح نہیں ہوں مجھے ہلکا نہ سمجھ

ساقی فارقی

اوروں کے روز شب تو سجاتا ہے رات دن
میری بھی کوئی شام سہانی بنائے جا

ظفر اقبال

کل رات سونی چھت پہ عجب سانحہ ہوا
جانے دو یار کون بتائے کہ کیا ہوا

محمد علوی

دمک رہا تھا بہت یوں تو پیرہن اس کا
ذرا سا لمس نے روشن کیا بدن اس کا

منچندا بانی

جدید غزل میں نسائی لہجہ کی بازگشت بھی کافی سنائی دیتی ہے۔ جدید شاعرات نے اپنے احساسات و جذبات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جا رہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

پروین شاکر

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

کشور ناہید

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسر الزام تو آئے

ادا جعفری

غرض یہ کہ جدید غزل میں واردات حسن و عشق کی مختلف کیفیات و احساسات نئے طرز اور نئے نکھار کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ یہاں بھی حسن و عشق کی تمام رنگینیاں و دلفریبیاں موجود ہیں جو کہ روایتی و خیالی قصے کے بجائے حقیقی مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں۔

□□□

Shazia Bano
Research Scholar
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

عشرت ناہید

رنگِ آسماں

''میم۔۔۔کیا زمین کا تصور آسمان کے بنا کیا ہی نہیں جا سکتا؟''

وہ حیران کن سوال سن کر ہاں یا نہیں کے گرداب میں پھنس گئی اور سوچنے لگی قدرت نے بھی زمین کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا ہے، دل حیران تو دماغ پریشان ہے زمین کو ساری زرخیزی عطا کردی ساری برداشت اس کے حصے میں ڈال دی، تخم بھی اسی کے اندر جانا ہے، نشوونما کے لیے اسے اپنے ہی اندر سے پانی اور ضروری غذائی اجزا کو کشید کرنا ہے، تخلیق کا درد بھی اسے سہنا ہے۔لیکن رہنا ہے اسے سائبان کے تلے، اور سائبان کیسا کٹھور، دور اتنی دور کہ کبھی وہ اسے پانے کی کوشش بھی کرے تو اس کا وجود بکھر بکھر جائے لیکن وہ اسے نہ مل پائے اور وہ خوش گمانی کے دوش پر سوار خانہ بدوشوں کی طرح ایک خیمے سے دوسرے خیمے کا سفر طے کرتی رہے، کہ شاید اب اسے دائمی سکون مل جائے لیکن یہ کیا دوسرا خیمہ تو پہلے والے سے بھی زیادہ ناپائیدار، وہ کیا کرے۔وہ تو ایک کمزور سی زمین ہے جسے ہمیشہ یہی کہا گیا کہ اسے رہنا آسمان کے تلے ہی ہے، جبکہ سائبان کا کوئی بھی روپ شجر سایہ دار نہیں بنتا، چاہے باپ ہو، بھائی ہو یا شوہر اف یہ زمین کیا کرے؟ کیسی مجبور و بے بس ہے وہ، اس آسمان کی بے کرانی پر کبھی بھی وہ بہت زچ ہو جاتی سوچتی کہ اے کاش وہ خود اتنی طاقتور ہو جائے کہ یہ سائبان اس کے قدموں میں گر جائے ،سسکے، تڑپے اس سے پناہ کی بھیک مانگے اور اس وقت وہ سر اٹھا کر بے رحم بن جائے اسے معاف نہ کرے وہ بھی اس کی معمولی خطا کی ایسی سزا دے کہ وہ لاکھ زمین آسمان ایک کرنے کی دھمکی دے مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔مگر ایسا کہاں ہوتا ہے زمین کا تو مقدر ہی رل جانا ہے جیسے کہ ساجدہ کی ماں ایک دن برباد کردی گئی ایک معمولی سی خطا پر کہ سبزی میں نمک زیادہ ہو گیا۔وہ معافی کی بھیک مانگتی رہی، لیکن شوہر نما سائبان اپنی بلندی کے غرور میں اسے لات گھونسوں اور گالیوں سے نوازتا رہا اور وہ ڈر کے مارے دروازے کے پردے میں چھپی یہ سب دیکھتی رہی۔کتنی بڑی تھی وہ صرف تین سال کی، کچھ باتیں اس کا ننھا سا ذہن سمجھ رہا تھا کچھ نہیں اور پھر باوا نے نہ جانے ایسا ماں سے کیا کہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی نہیں، نہیں ایسا ظلم نہ کرو، میں کہاں جاؤں گی اپنی بچی کو لے کر، ارے مجھ پر نہیں تو اس معصوم پر رحم کردو۔مجھے مارلو اور مارلو لیکن طلاق نہ دو لیکن وہ تو اسے گناہ عظیم کی سزا دے چکا تھا۔گالیاں بکتا گھر سے نکل کر اڈے کی طرف چل پڑا تھا کہ اس کی بلندی کی وہی منزل تھی۔اس کا آسمان اس پر سرخ سرخ جلتے انگارے ڈال گیا تھا جس سے اس کا بدن ہی نہیں روح تک جھلس گئی تھی، اس کے سامنے لق و دق صحرا تھا جہاں وہ بے امان کھڑی تھی کہ اس کے سر سے سب سے بڑا سائبان ایک طوفان میں اڑ گیا تھا وہ حیران پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ کاش کوئی

مہربان ذات اسے سمیٹ لے، اس کی ماں کے جھگڑے اور رونے کی آوازیں سن کر پڑوس میں رہنے والی اس کی پھوپھی دوڑی چلی آئیں تھیں۔ اس کی ماں نے ان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا کہ یہ ٹھنڈی ہوا بنیں گی اس کے لیے لیکن وہ تو اس کی لٹی پٹی ماں جو نیم مردہ سی ہو رہی تھی کی لاش پر آخری تازیانہ لگا گئیں اسے اس کی ماں کی گود میں سے چھین کر بولی تھیں۔

''جا نکل اس گھر سے! لیکن اپنا خون ساتھ نہیں لے جانے دیں گے۔''

پھوپھی کے چھیننے پر وہ زور زور سے رونے لگی اس کی ماں بھی بلک کر ہاتھ جوڑتی رہی،

''نہیں نہیں ایسا ظلم نہ کرو!''

لیکن ان پر اثر نہیں ہوا،

''ارے جا جا نکل یہاں سے بے ڈھنگی، اپنے آدمی کو تو خوش رکھ نہیں پائی اس کی بچی کو کیا خوشی دے گی، نکل یہاں سے۔''

پھوپھی نے بھی اس ماں کی پیٹھ پر اس زور سے لات ماری کہ وہ بیٹھے بیٹھے ہی لڑھک گئی، دردسا درد تھا، کس کا شکوہ کرتی وہ آسمان کا یا سامنے کھڑی ڈائن سی دوسری زمین کا جو اس کے وجود کو بھسم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جسے اس نے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا سمجھا تھا لو کا جھکڑ بن گئیں تھیں اے کاش کہ وہ اس کا درد سمجھ لیتیں، ماں سے بچی جدا نہ کرتیں تو یوں آج یہ بچی مجھ سے یہ سوال نہ کر رہی ہوتی کہ میم کیا زمین کا تصور آسمان کے بنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔

معصوم سی پیاری سی ساجدہ، ۔جس نے ابھی اسی سال ہمارے اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ لیا تھا،، پندرہ سولہ سال کی بڑی پیاری گول مٹول سی لڑکی، اونچا سا قد، بھرا بھرا جسم، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، جب یونیفارم کے ساتھ دو چوٹیوں میں سرخ ربن لگائے آتی تو پوری کلاس میں نمایاں سی نظر آتی اس کے سوال نے مجھے اس کی ذات کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آخر اس بچی کے ذہن میں یہ سوال کیوں آیا؟ اس دن بھی میں کاپیاں چیک کرتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ

شہلا اور دو لڑکیاں تقریباً چلاتے ہوئے اسٹاف روم میں آئیں۔

''میم! میم ساجدہ بے ہوش ہوگئی ہے۔''

''کیا ہوا ساجدہ کو؟''

''پتہ نہیں میم اس کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

میں فوراً اٹھی اور کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

ساجدہ ٹیبل پر سر رکھے بے ہوش تھی، اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہلکا سا کسمسائی،

''ساجدہ ساجدہ! آنکھیں کھولو بیٹا، کیا ہوا ہے تمھیں؟''

''کیا ہو رہا ہے پیٹ میں درد ہے؟''

عموماً بچیوں کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اس نے ذرا سا سر کو اٹھانے کی کوشش کی، انکار میں سر ہلایا لیکن پھر سر ٹیبل پر ٹکا دیا، اس پر دوبارہ غنودگی سی طاری ہوگئی تھی، اب وہ بے ہوش نہیں تھی، وہ میری آواز سن رہی تھی۔ ساری لڑکیاں ارد گرد جمع تھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

''ایک تو اسے کلاس میں نیند بہت آتی ہے۔'' زرینہ بولی

''میم لنچ ٹائم میں تو یہ روز ہی سو جاتی ہے لنچ بھی نہیں کھاتی۔'' نیہا نے فکرمندی سے کہا

''کھائے گی کہاں سے لاتی ہی نہیں ہے۔'' شہناز نے بتایا

''یہ لنچ نہیں لاتی ہے!!'' میں حیران ہوگئی کیونکہ اسکول صبح ساڑھے سات سے تقریباً تین بجے تک ہوتا تھا، اتنی دیر بنا لنچ کیے مشکل تھا۔

''نہیں میم ہم نے تو کبھی اس کے پاس لنچ نہیں دیکھا اور تو اور میم جب ہم اسے کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کھا لو تو بھی نہیں کھاتی بس سو جاتی ہے۔''

ایک دم مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اسے کیا ہوا ہے اسے غنودگی نہیں نڈھالی ہے جو بھوک کے باعث ہے۔ میں نے فوراً اپنے پرس سے بسکٹ نکالے اور اسے زبردستی اٹھا کر کھانے کو کہا اس نے پانی پیتے پیتے بسکٹ جیسے تیسے کھائے۔ تھوڑا سا اس کو قرار آنے لگا۔

اسی دوران میں نے طیبہ میم کو بھی بلا لیا تھا وہ سینئر ٹیچر اور انچارج پرنسپل تھیں اور بچیوں سے بڑی شفقت رکھتی تھیں۔ انھیں ساجدہ کی حالت کے بارے میں بتایا، انھوں نے سب لڑکیوں کو اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھنے کو اور مجھ سے ساجدہ کو لے کر اپنے چیمبر میں آنے کو کہا۔ وہاں اسے دو بسکٹ اور کھلائے جب اس کی طبیعت بحال ہونے لگی تب پانی پلایا، اور اس سے بہت پیار سے پوچھا

''بیٹا کب سے کھانا نہیں کھایا تھا؟''

وہ خاموش ایک ٹک انھیں دیکھنے لگی پھر زمین کی طرف، شاید وہ کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ شاید وہ چاہ رہی تھی کہ زمین کی طرح ہر بات صرف اس کے اندر جذب رہے اور باہر جو کچھ بھی آئے ایک ترو تازگی اور خوشبو ہی پھیلائے، اتنی سی لڑکی اور صبر و برداشت زمین سا۔ یہ صفت شاید ہر عورت میں اسی وقت سے سرایت کر جاتی ہے جب اس کے وجود کو

مونث قرار دیا جاتا ہے۔
میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر پوچھا
''ساجدہ رات کو کھانا کھایا تھا؟''
اس نے انکار میں سر ہلا دیا
''کل صبح ؟''
پھر سر ہلایا
میں چونکی
''پرسوں بھی نہیں کھایا تھا؟''
نہیں میم اب اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔
میں نے طیبہ میم کی طرف دیکھا انھوں نے مجھے ،ہم دونوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ بچی کسی وجہ سے پریشان ہے۔
''بیٹا ممی سے ناراض ہو یا ابو نے ڈانٹا ہے''
''نہیں میم میرے پاس امی ابو نہیں ہیں؟''
''کیوں بیٹا امی ابو کہاں ہیں؟''
اس نے کوئی جواب نہیں دیا
''تمھارے امی ابو کہاں ہیں؟'' طیبہ میم نے دوبارہ پوچھا
''میم جب میں تین سال کی تھی تب ہی امی ابو کے درمیان طلاق ہو گئی تھی میں اپنی پھوپھی کے پاس رہتی ہوں ۔۔۔'' کچھ کہتے کہتے وہ پھر چپ ہو گئی، امی ابو سے ملاقات ہوتی ہے۔
نہیں میم دونوں کی شادی ہو چکی ،پھوپھی کسی سے ملنے نہیں دیتیں۔
امی سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے ۔ویسے مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتی ہیں ایک مرتبہ ایک شادی میں وہ ملی تھیں ،انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہیں پاس میں ان کا گھر ہے۔''
''اچھا یہ بتاؤ تم نے دو دن سے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا؟''
''مجھے کام میں دیر ہو جاتی ہے تو میرا کھانا کتا کھا جاتا ہے''
''کتا، کتا کیسے کھا جاتا ہے؟'' میں حیران ہو گئی۔
وہ۔۔۔وہ میم۔۔۔ہم نہیں بتا پائیں گے۔۔۔'' وہ بے طرح رو پڑی۔ زمین میں کہیں دراڑ پڑنے لگی تھی ۔ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تو آنسوؤں کی دبیز تہہ تلے درد کو چھپانے کی کوشش ،اففف یہ زمین بھی بھلا آنسوؤں سے زمین کی دراڑیں بھرتی ہیں کیا؟
ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف درد سے دیکھتے رہ گئے۔
''بیٹا آپ ہمیں نہیں بتاؤ گی تو کیسے ہمیں تمھاری پریشانی پتہ چلے گی۔''
''میم پھوپھو کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں بہت ماریں گی۔''
''بیٹا ہم وعدہ کرتے ہیں آپ سے کہ جو بھی بات آپ ہم سے کرو گی ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔''
میم وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی اور ہم دونوں سننے والوں کے کانوں میں جیسے سیسہ گھول رہی تھی۔
''میم وہ ہمیں جب بھی پھوپھو کوئی کام دیتی ہیں تو گھڑی میں ٹائم بتاتی ہیں کہ اتنے منٹ میں برتن دھل جانا چاہیے اور یہ کھانا رکھا ہے اس کے بعد کھانا ہے اگر اتنے منٹ میں کام ختم نہیں ہو پاتا تو وہ ہمارا کھانا کتے کو کھلا دیتی ہیں اور ہمیں مارتی بھی ہیں۔''
اف،،،میری تو روح ہی کانپ گئی۔ بچی پر کیسا ظلم تھا۔
ہم نے اس سے آگے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔
ہم دونوں بہت دیر تک اس کے بارے میں بات کرتے رہے کہ بچی کو کیسے آزاد کروایا جائے لیکن کوئی حل سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔
اس واقعے کے دو دن بعد ہی ایک اور بات ہوئی اس دن لنچ ٹائم میں ساجدہ سے اس کے والد ملنے کے لیے آئے۔ چپراسی کی اطلاع پر ہم دونوں بھی ملاقات روم میں گئے ساجدہ ایک طرف کھڑی تھی اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا نہ جانے انھوں نے کیا کہا تھا ہمیں دیکھ کر کہنے لگے ''میڈم جی، میری بیٹی کو لینے آیا ہوں، آپ اسے بھیج دیجیے۔''
''لیکن روز تو اسے اس کی پھوپھی لے کر آتی اور جاتی ہیں؟''
کہنے لگے ''میڈم جی میری بہن نے اس کو ماں بن کر پالا ہے، اس کی ماں تو تین سال کی بچی چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔''
''نہیں میم میری امی نہیں بھاگی تھیں جھوٹ بول رہے ہیں ابو۔''
''چپ سالی۔۔۔ وہ گالی بکتے بکتے رکا اور اتنا ہی کہا ''اب بھی اس ماں کے لیے بولتی ہے۔ ارے میڈم جی میری بہن کی کوئی لڑکی نہیں ہے، اس نے اسے اپنی جان سے عزیز رکھا ہے میں تو اسے اپنے ساتھ اس لیے نہیں رکھتا کہ سوتیلی ماں نہ جانے کیا سلوک کرے لیکن اب اس کی ماں بھی بیمار رہنے لگی ہے یہ تھوڑا کام وام بھی دیکھ لے گی اور اب اس کی شادی بھی کرنا ہے میں نے ایک رشتہ دیکھ لیا ہے۔''
''شادی! ابھی سے شادی ابھی تو یہ بہت چھوٹی ہے'' طیبہ میم نے کہا
''تو کیا ہوا جلدی گھر بسے گا تو بھاگے گی نہیں ماں کی طرح۔''
''میری امی نہیں بھاگی تھیں میم ،میرے ابو نے انھیں طلاق دے دی تھی۔ بچی کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

اف یہ الزام تراشیاں، کب تک کردار کشی ہی مرد کا ہتھیار بنی رہے گی،
"ابھی چھٹی کا وقت نہیں ہوا ہے۔ چھٹی کے وقت ہی آیئے گا آپ۔"

"ارے تب تو اس کی پھوپھو نہیں جانے دے گی۔"

"کیوں؟"

اسے وہ رشتہ پسند نہیں جس سے میں اس کی شادی کرنے والا ہوں، میڈم جی میرا دوست ہے اچھا کماتا ہے اسے خوش رکھے گا اُس نے بٹیا کو دیکھا ہے۔ دیکھیے وہ سامنے کھڑا ہے"

"دوست !!" اس کی نظروں کے تعاقب میں باہر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا کالا سا آدمی کھڑا تھا جس کے چہرے کو چیچک کے داغوں نے مزید بدنما بنا دیا تھا، چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ لیے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"اچھا ابھی آپ جایئے ہم اسے نہیں بھیج سکتے۔" طیبہ میم نے سختی سے کہا

وہ بولتا ہوا چلا گیا کہ "میں باپ ہوں میری بیٹی نے مجھے ہی منع کر دیا کتنی خراب دنیا ہے۔"

جب اس کی پھوپھو لینے آئیں تب ہم نے ان سے پھر بات کی اور بتایا کہ اس بچی کو باپ لے جا رہا تھا۔

وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں میڈم جی آپ کا بہت بہت شکریہ، یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ وہ ہے میرا بھائی، اور اس کا باپ لیکن بری عادتوں میں پڑ گیا ہے اسی لیے اس کی ماں کو طلاق دے ڈالی اور اب اس بچی کے پیچھے پڑا ہے وہ جس سے اس کی شادی کرنے کی بات کر رہا وہ اس کا دوست ہے جس سے اس نے بہت قرضہ لیا ہوا ہے اسے ہی وہ بیٹی کی شکل میں اتارنا چاہتا ہے۔"

اف سن کر ہمارا تو دماغ ہی گھوم گیا کہاں تو ہم اس بچی کو اس پھوپھو کے عذاب سے نکالنے کی بات کر رہے تھے کہاں یہ نئی کہانی۔

ساجدہ کو کہاں کیسے نجات دلائیں پھر سوال ہمارے سامنے کھڑا تھا دن رات بس اسی کی فکر تھی۔ ہمارے بس میں بھی کچھ نہ تھا کوئی ایسا ادارہ پھر فوراً اس خیال کو جھٹک دیا کہ ادارے بھی کہاں محفوظ جگہ ہیں؟

گو کہ آسمان کی وسعتیں بے کراں ہیں لیکن پل پل رنگ بدلنا بھی تو اس کی فطرت ہے۔

ہم سر جوڑے انہی مسائل کو دیکھ رہے تھے۔ لنچ میں ٹفن تو دوسرے دن سے ہی چپ چاپ دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن وہ بہت کھوئی کھوئی سی رہتی۔ میں اور طیبہ میم دونوں ہی کو ایسا لگتا تھا کہ کچھ اور بھی ہے جو یہ بچی بتا نہیں رہی ہے۔ یہ بہت ڈری ڈری سہمی سہمی سی ہے۔ اس دن بھی وہ بہت اداس خاموش سی تھی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل سی لگ رہی تھیں میں نے پوچھا

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ تم روز کلاس میں کیوں سو جاتی ہو، تمھاری شکایتیں مل رہی ہیں" وہ معصوم نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بتاؤ کیا تم رات میں جاگتی رہتی ہو؟"

"جی، جی میم ہم رات میں پڑھائی کرتے ہیں"

"اوہ۔۔ گڈ کب سے کب تک"

"میم ہم دس بجے کے بعد پڑھنے بیٹھتے ہیں اور پھر سوتے ہی نہیں ہیں"

"کیا مطلب؟"

ساجدہ کی باتیں حیران ہی کرتی رہتی ہیں، میں سوچ رہی تھی۔

"کیوں، کیوں نہیں سوتی ہو؟ "

"وہ۔۔ وہ میم ہمیں سونے سے ڈر لگتا ہے"

"ارے بیٹا اتنی بڑی ہوگئی ہو اور ڈرتی ہو رات کو دعائیں پڑھ کر سویا کرو نا۔" طیبہ باجی نے سمجھایا

میم دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا" اتنی بے زاری حیرانی سی حیرانی۔

"کیا کہہ رہی ہو"

"میم۔۔ میم" وہ بے اختیار رو پڑی۔

کلاس ختم ہو رہی تھی میں اسے طیبہ میم کے چیمبر میں لے آئی پانی پلایا اور کہا کہ "بیٹا تسلی سے بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

وہ پھر رو پڑی "میم۔۔ ہم مر جائیں گے"۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا ، بیٹا ہوا کیا ہے؟"

میں نے اسے گلے لگایا اس کے درد پر میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں نے کہہ دیا تھا کہ بچی کسی بڑے کرب سے گزر رہی ہے۔ اسے بہت اعتماد میں لے کر اسے چپ کراتے ہوئے پھر پوچھا "بیٹا کس بات کا ڈر لگتا ہے تمھیں؟"

"میم میم ۔۔ کبھی کبھی پھوپھو سے چھپ کر زبیر بھائی شام میں سموسے لا دیتے ہیں، اس رات ہم سو جاتے ہیں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہمارے بستر میں گھس آیا ہے، میم پھر ہمارے پیٹ میں درد بھی بہت ہوتا ہے۔"

"یا خدا۔" میرا تو سر گھوم گیا۔ یہ آسمان کے بدلتے روپ، یہ نیلا امبر کیسے کیسے ڈراؤنے روپ لے کر سامنے آتا رہتا ہے، اسے تو کسی رشتے

کے تقدس کا احساس ہی نہیں۔

''تم نے اپنی پھوپھو کو یہ بات نہیں بتائی۔'' میم نے پوچھا

''نہیں میم زبیر بھائی کہتے ہیں کہ سموسے کی بات امی کو نہیں بتانا نہیں تو بھوکی مروگی۔''

اور پھر میم پھوپھو بھی کہتی ہیں کہ ''یہاں میرے بیٹوں کا ہر کہنا ماننا ہوگا وہ جو بھی کہیں کرنا ہوگا۔''

'یا خدا اس بچی کی زندگی۔۔۔افف کیسے جی رہی ہے۔

''بیٹا آپ کلاس میں جایئے۔''

اس کے باہر جاتے ہی میری آنکھوں سے تو آنسو ہی رواں ہو گئے۔استادر دیہ معصوم سی بچی جھیل رہی، افف۔''

''کیا کریں اب ہم۔''

''دیکھو اس بچی کا یہی حل ہے کہ اب ہمیں اس کو کسی طرح اس کی ماں تک پہنچا دیں۔ ماں سے زیادہ بچے کی کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔'' طیبہ میم نے کہا

''وہ کہہ رہی تھی نا اس دن کہ اسے اپنی امی کا گھر پتہ ہے۔'' پھر اس سے پتہ سمجھ کر چپراسی کو بھیج کر انھیں بلوایا اور انھیں ساجدہ کی پوری کہانی سنائی وہ دکھی ماں زار و قطار رونے لگی۔ روتے روتے ہی کہنے لگی میڈم بہت ظالم لوگ ہیں وہ، مجھے ہر وقت اپنی بچی کی فکر لگی رہتی ہے لیکن کیا کروں مجھے ملنے نہیں دیا کبھی بھی ان لوگوں نے۔ شکر ہے خدا کا کہ میرا یہ شوہر شریف ہے کسی بری لت کا شکار نہیں ہے۔ سکھ چین کی روٹی مل رہی ہے لیکن پھر بھی میری مامتا مجھے چین نہیں لینے دیتی کئی بار میں نے کوشش کی کہ میری بچی مجھے مل جائے لیکن وہ نہیں دیتی۔''

''اب ہم دلوائیں تو تم رکھ لوگی؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں میڈم''

''تمھارا شوہر راضی ہو جائے گا۔''

''ہاں ہاں میڈم جی وہ بہت اچھے ہیں، مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، وہ ضرور راضی ہو جائیں گے'' زمین کی خوشحالی نے سکون دیا۔

''ٹھیک ہے تم اپنے شوہر سے بات کر کے ہمیں بتا دینا ہم کچھ راستہ نکالیں گے اور اسے تمھارے پاس پہنچا دیں گے ۔''

''دوسرے ہی دن وہ خوشی خوشی اسکول آئی اور بتایا کہ اس کا شوہر بخوشی بیٹی کو ساتھ رکھنے پر تیار ہے میڈم میں کیسے اپنی بیٹی کو لے جا سکتی ہوں؟''

''تمھاری بیٹی کب لے کر جانا ہے، ہم تمھیں جلدی خبر کر دیں گے۔''

''جی میڈم''

دوسرے دن ہم نے ساجدہ کی پھوپھو کو بلایا اور ان سے کہا کہ بچی کو ماں کے حوالے کر دو۔ سنتے ہی انھوں نے ہنگامہ مچانا شروع کیا ہی تھا کہ ہم نے انھیں پولیس کی دھمکی دی لیکن وہ ڈری نہیں کہنے لگی ''ابھی میں اس کے باپ کو بلاتی ہوں لڑکی باپ کے پاس رہے گی اگر میرے پاس نہیں رہی تو۔''

''ارے رکو ذرا رکو، بات سنو، تمھیں معلوم ہے تمھارے بھائی نے ساجدہ کی امی کو طلاق کیسے دی تھی، ایک ساتھ تین طلاق نا، پتہ ہے نا تمھیں کہ اب ہمارے ملک میں نیا قانون بن گیا ہے ایک ساتھ تین طلاق کا۔ تمھارا بھائی تو ابھی اس کی امی کی شکایت پر سیدھا جیل جانے والا ہے اور بچی کو زبردستی ماں سے چھین لینے کے جرم میں تم بھی'' ہمارا حربہ کام کر گیا جس کا ہمیں پورا اندازہ تھا۔

وہ مارے ڈر کے کانپنے لگی۔

''میڈم جی ماپھ کر دو، دے دو، دے دو اس کلموہی کو ہی اس کی بیٹی، اس کی ماں کو دے دو اسے، میں کبھی نہیں کہوں گی کہ ذرا سی تھی جب سے میں نے ماں بن کر پالا، میڈم کبھی نہیں کہوں گی کہ میری بیٹی ہے۔''

اس کی بدلتی حالت دیکھ کر میری تو ہنسی ہی نہیں رکی۔

یوں ساجدہ حفاظت سے اس کی ماں تک پہنچ گئی ہم دونوں نے سکھ کی سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارے ہاتھوں ایک بچی کی زندگی سدھر گئی۔

ساجدہ اب اپنی امی کے گھر سے اسکول آنے لگی تھی، ذہین تو تھی اس نے دسویں جماعت اچھے نمبروں سے پاس کی، سکون اور اطمینان کی زندگی نے اس کی خوبصورتی کو اور نکھار دیا تھا، وہ اب بہت چہکنے لگی تھی اسکول کے ہر پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھی لیکن کچھ مہینوں کے بعد ہی وہ پھر پہلے والی ساجدہ بن گئی، اس دن وہ طیبہ میم کے چیمبر میں چلی آئی تھی اتفاق سے میں بھی وہی تھی شاید وہ دیکھ کر ہی آئی تھی۔ کہنے لگی ''میم کچھ بات کرنا ہے اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔''

''کیا ہوا بیٹا، کوئی خاص بات''

''جی میم'' آپ کو ہماری ماسی نے گھر بلایا ہے۔''

''ماسی نے !! ماسی نے کیوں؟''

''میم آج صبح جب ہم اسکول آ رہے تھے انھوں نے یہی کہا تھا۔''

''تم ماسی کے گھر سے آ رہی تھیں؟''

''اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا تھا

''میم کیا ہمیں کبھی کوئی گھر نہیں ملے گا جہاں ہم رہ سکیں، میم لڑکیوں کا کوئی گھر ہی نہیں ہوتا کیا؟'' وہ رو پڑی تھی

آج پھر ساجدہ نے ویسا ہی سوال کر دیا تھا، جس نے ایک عرصے سے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

''ارے کیسی بات کر رہی ہو بیٹا اب کیا ہوا اب تو تم اپنی امی کے پاس ہو نا، تمھاری امی کا گھر تمھارا گھر ہے نا؟''

''نہیں میم وہ میرے نئے ابا کا گھر تھا''

''تھا؟ کیا تم وہاں نہیں ہو'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''نہیں ہم ماسی کے گھر ہیں''

''کیوں؟''

''وہ۔ وہ میم وہاں بھی تو ابا ہیں نا'' آسمان پر گھرے سیاہ بادل منڈرا رہے تھے اور زمین پھر خوف سے لرز رہی تھی اور میں پھر ایک مرتبہ سوچوں کے سمندر میں غرق ہوئی جا رہی تھی بس زمین کی یہی حقیقت کہ وہ ہمیشہ پیروں میں رہتی رہے؟ خوف و دہشت کے سائے میں رہے، آسمان کا ہر روپ اس پر بجلیاں گراتا رہے۔

اگر وہ خود کو کبھی موسم کے حوالے کر دیتی تو وہ بھی آسماں کی طرح کیسے کیسے رنگ بدلنے لگتا وہ ڈر کر پھر سے سمٹ جاتی، کبھی کوئی موسم خوشگوار بننے کی کوشش کرتا بھی تو ہوا اسے ٹھہرنے ہی نہیں دیتی۔ ہوا بھی تو کیسی دشمن ہے، مونث ہے لیکن کمبخت کتنی بے رحم، اسے کبھی کسی سائبان کے تلے بیٹھی کسی عورت کے سکھوں کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ پھر وہ ہواؤں کے حوالے کر دینے کا سوچتی کہ وہ چاہیں جس سمت اسے اڑا لے جائیں لیکن ہوائیں بھی تو کہاں باد صبا بنتی ہیں وہ بھی جب کٹھور ہوتی ہیں تو ان کی سختی کے آگے بڑی بڑی چٹانیں بھی ہل جاتی ہیں بکھر جاتی ہیں۔ وہ تو ایک کمزور سی زمین ہے جسے ہمیشہ یہی کہا گیا کہ اسے رہنا آسمان کے تلے ہی ہے، آخر کار وہ آسمان ہی کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگتی، کبھی کبھی وہ اس پر مہربان بھی ہو جاتا اسے تاروں بھری رات عطا کر دیتا لیکن جب برہم ہوتا تو سرخ سرخ جلتے انگارے اس کے بدن پر ڈال دیتا وہ جھلس جھلس جاتی لیکن اسے اماں نہ ملتی، سائبان کا کوئی بھی روپ شجر سایہ دار نہیں بنتا، چاہے باپ ہو، بھائی ہو یا شوہر اف یہ زمین کیا کرے؟

''ماسی کے گھر میں کون کون ہے؟'' طیبہ میم کے سوال نے اسے سوچوں کے گرداب سے نکالا

''ماسی خالو اور ان کا ایک بیٹا ہے میم بہت اچھے ہیں سب، ماسی تو بہت ہی محبت کرتی ہیں، خالو بھی بہت اچھے ہیں اور بھائی بھی لیکن میم مجھے تو پھر بھی سب سے ڈر لگتا ہے''

وہ سچ کہہ رہی تھی ہر رشتے نے اسے بے اعتبار جو کیا تھا۔

ساجدہ ہمیں اپنی کہانی سنا کر دکھ کے سیلاب میں چھوڑ کلاس میں جا چکی تھی اور ہم دونوں کے پاس بات کرنے کے لیے بھی الفاظ نہیں تھے، اس لیے اس کے جانے کے بعد بھی خاموش ہی رہ گئے۔

دوسرے دن جب ہم ساجدہ کے ساتھ وہاں پہنچے تو اس کی ماسی اور خالو ہمارا انتظار کر رہے تھے، ان کا بیٹا بھی وہاں موجود تھا۔ دونوں کو دیکھ کر ایک تشویش سی دل میں پیدا ہوئی۔ ساجدہ کے حالات دیکھ کر سوچ فطری تھی۔

ماسی نے کہنے لگیں ''میڈم جی ہم نے اسے بیٹی بنا کر بہت دن رکھ لیا اب ہم اسے ایسے نہیں رکھ پائیں گے''

وہ بول رہی تھیں اور ساجدہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا پھر اس کے چہرے پر سفید رنگ ٹھہر سا گیا۔

''میڈم جی ہماری اس بچی نے بہت دکھ اٹھایا ہے اب اس کی زندگی میں کوئی دکھ نہ آئے اس لیے ہم ایک فیصلہ کر رہے ہیں آپ دونوں نے اسے زندگی کے ایک بڑے عذاب سے رہائی دلوائی ہے اس لیے اس میں آپ کو شریک کرنا ضروری ہے۔ میم جی کل ساجدہ کا نکاح میرے بیٹے کے ساتھ۔۔۔۔۔'' ان کا جملہ پورا بھی نہ ہو پایا تھا کہ ساجدہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی صدیوں کا بندھا باندھ ٹوٹ گیا تھا، وہ دریا کیسا خوشی کا تھا جو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا اپنے ساتھ سارا درد بہاتا چلا گیا اور ساجدہ کو ہی نہیں مجھے بھی اس کے سوال کا جواب مل گیا تھا میرے اور میم کی آنکھوں میں نمی لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ دل کی بنجر زمین پر لفظوں کی پھوار برس رہی تھی زمین سیرابی کی طرف گامزن تھی لیکن تھی پھر بھی ایک آسمان تلے نیلے نیلے امبر تلے۔

□□□

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus
504/122 Taigore Marg
Near Shabab Market
Lucknow (U.P.) 226 020
Mob 09598987727

نیلوفر پروین

دائروں کے بیچ

حویلی سے پونم کے واپس جاتے ہی اجیت نے کہا...... ماں جی، پونم بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس میں وہ سارے گُن ہیں جو آپ اپنی ہونے والی بہو میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ آپ کو سنسار کے سارے سکھ دے سکے گی۔

''نہیں بیٹا .... پونم میں لاکھ گُن اور سندرتا سہی، پر ہم اعلیٰ ذات کے ٹھاکر خاندان کے لوگ بھلا ایک نچلی ذات کی لڑکی کو کیسے بہو بنا سکتے ہیں؟ ہمارا سماج بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ ...... ٹھاکر رنجیت سنگھ کا لڑکا اور ایک نچلی ذات کی لڑکی سے شادی....... رام....... رام......."

''لیکن ماں جی ہم ایک دوسرے سے انتھک پریم کرتے ہیں اور میں تو پونم کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا وعدہ بھی کر چکا ہوں۔''

''نہیں .... یہ نہیں ہوسکتا۔ تم خاندانی اور سماجی اصولوں کی سیماؤں سے نہیں نکل سکتے''.... اجیت اپنی ماں کے فیصلے پر تڑپ اُٹھا۔

اگلی شام حسب معمول پہاڑی سے بہتی ہوئی پر شور ندی کے کنارے پونم اجیت کی منتظر تھی، لیکن آج اس کے سینے میں بھی ندی کی طرح شور ہو رہا تھا۔ کبھی وہ کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اس پگڈنڈی کو دیکھتی جہاں سے اجیت کو آنا تھا اور کبھی نیچے اُتر کر مضطرب سی ٹہلنے لگتی۔

آخر تھک کر وہ ندی کے کنارے بیٹھ گئی اور اپنے پیروں کو ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا۔ اسے اجیت پر بیحد غصہ آ رہا تھا۔ آج اس نے خلاف معمول آنے میں کافی دیر کر دی تھی، اور ادھر وہ اس سے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے لیے بے چین تھی، کیونکہ کل شام اجیت اسے اپنی ماں سے ملانے حویلی لے گیا تھا اور گھر واپس آ کر وہ ساری رات یہی سوچتی رہی،

کیا اجیت کی ماں اسے قبول کرے گی؟.......

پونم کے من میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے، لیکن اجیت نے اسے اپنانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے انتھک پریم پر اسے پورا وشواس تھا، وہ اپنی محبت کے درمیان سے اونچ، نیچ کی ہر دیوار کو ہمیشہ کے لیے گرا دینا چاہتا تھا۔ پونم اپنے خیالوں میں گم تھی کہ کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر دیں ۔

اجیت ....بے اختیار پونم کے لبوں سے نکلا۔ وہ اس کے ہاتھوں کے لمس کو پہچان گئی تھی۔ اجیت مسکراتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی خوبصورت بل کھاتی زلفوں کو اس کے شانوں پر بکھیر دیا، جانے کتنی دیر دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں گم پیار بھری باتیں کرتے رہے .... لیکن پونم کو تو ماں جی کا فیصلہ سننے کی جلدی تھی آخر اس نے پوچھ ہی لیا.......

اجیت.......ماں جی نے میرے بارے میں کچھ کہا.......پونم کے اس سوال پر اجیت سٹپٹا گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اگر ماں جی اس کی زندگی تھی تو پونم اس کی جان.......اور دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کھونے کی اس میں قطعی ہمت نہ تھی کیونکہ کسی ایک کو بھی کھو کر وہ خود ٹوٹ کر بکھر جاتا۔

اے..... کیا سوچ رہے ہو بتاؤ نا.... پونم نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

اجیت شش و پنج میں رہا کہ پونم سے کیسے کہے پر ہمت کر کے اس نے ماں جی کا فیصلہ سنا دیا۔ پونم نے سب کچھ سنا مگر سمندر کی طرح شانت رہی۔ تاہم من کی گہرائیوں میں ہزاروں طوفاں اٹھتے رہے۔ جب اجیت نے ماحول کی اداسی سے گھبرا کر خاموش سی پونم کے کومل ہاتھوں کو تھامنا چاہا تھا تو وہ سرکش لہروں کی طرح بپھر اُٹھی۔

"مت چھوؤ مجھے .... تم نے میرے پریم کا وشواس گھات کیا ہے....... تم امیر لوگ ہم غریبوں کو اپنے پریم جال میں پھنسا کر ہمارا تن من لوٹنا جانتے ہو ہمیں اپنانا نہیں۔"

اجیت نے پونم کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی باتوں کو سنے بغیر روتی ہوئی پگڈنڈی پر دوڑتی چلی گئی .... پھر کئی دنوں تک وہ اس سے ملنے بھی نہ گئی۔ اجیت روز ندی کنارے گھنٹوں اس کا انتظار کرتا اور مایوس لوٹ جاتا۔ پونم بھی بے چین رہتی پر اپنے اندر ہزاروں دکھ چھپائے وہ خاموشی سے گھر کے تمام کاموں کو نپٹاتی رہتی....... گھٹتی رہتی، اس کی یہ حالت دیکھ کر لاجونتی کے دل میں کھٹک ہونے لگی، پوچھنے پر وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیتی تھی۔

"اجیت نے پونم کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی باتوں کو سنے بغیر روتی ہوئی پگڈنڈی پر دوڑتی چلی گئی.......پھر کئی دنوں تک وہ اس سے ملنے بھی نہ گئی۔ اجیت روز ندی کنارے گھنٹوں اس کا انتظار کرتا اور مایوس لوٹ جاتا۔ پونم بھی بے چین رہتی پر اپنے اندر ہزاروں دکھ چھپائے وہ خاموشی سے گھر کے تمام کاموں کو نپٹاتی رہتی....... گھٹتی رہتی، اس کی یہ حالت دیکھ کر لاجونتی کے دل میں کھٹک ہونے لگی، پوچھنے پر وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیتی تھی۔"

ایک دن سانجھ ڈھلے جب لاجونتی مزدوری کر کے اپنے گھر واپس آئی تو پونم چارپائی پر اوندھی پڑی بہت رو رہی تھی۔ اچانک کسی بھیانک خیال نے لاجونتی کا دل دہلا دیا۔

پونم.......پونم....... کیا ہوا تجھے وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ کیوں رو رہی ہے تو۔۔۔؟

مگر پونم کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔ اب وہ ماں سے کیا کہتی...... اس نے تو پہلے ہی اسے اجیت سے ملنے سے روکا تھا، بہت اونچ نیچ سمجھائی تھی.......

ٹھاکر رنجیت سنگھ کے گزرنے کے برسوں بعد اجیت اپنی تعلیم مکمل کر کے جب شہر سے اپنے خوبصورت گاؤں آیا تو سیر کرتے ہوئے ندی کنارے اپنی سکھیوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی چنچل ہرنی سی پونم اس کے دل میں سما گئی اس نے اسے پسند کر لیا تھا یہ جانتے ہوئے کہ وہ دوسری ذات کی غریب لڑکی ہے۔ آہستہ آہستہ پونم بھی اس کی طرف کھنچتی چلی گئی آخر من پر کب کسی کا زور چلا ہے؟ اس نے بھی اپنے من کے سنگھاسن پر اجیت کو بٹھا لیا تھا۔ وہی اس کا دیوتا تھا ....اور پونم اس کی پجارن......."

ماں کے بار بار پوچھنے پر اس نے ہچکیوں کے درمیان اجیت کی کہی ہوئی ساری باتیں بتا دیں، لاجونتی پونم کے بکھرے بکھرے بال اور سوجی آنکھوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھی .... اسے ایسا لگا کہ کسی نے اس کے

سینے پر تیز خنجر اُتار دیا ہو۔

وہ ایک لمبی آہ کے ساتھ اُٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی .... چند لمحے وہ یونہی گھر کے باہر پھیلی تاریکی کو دیکھتی رہی .... جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ پھر پلٹی اور پونم کے ہاتھ تھام کر اُسے اُٹھایا اور گھر سے باہر نکل گئی دونوں اس راہ چل دیں جو حویلی کی طرف جاتی تھی۔ دور ٹھاکر رنجیت سنگھ کی بلند و بالا حویلی کی کھڑکیوں سے بکھرتی روشنی ایسی لگ رہی تھی جیسے سیاہ آسمان میں تارے جھلملا رہے ہوں۔

"وہ ایک لمبی آہ کے ساتھ اُٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی .... چند لمحے وہ یونہی گھر کے باہر پھیلی تاریکی کو دیکھتی رہی .... جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ پھر پلٹی اور پونم کے ہاتھ تھام کر اُسے اُٹھایا اور گھر سے باہر نکل گئی دونوں اس راہ چل دیں جو حویلی کی طرف جاتی تھی۔ دور ٹھاکر رنجیت سنگھ کی بلند و بالا حویلی کی کھڑکیوں سے بکھرتی روشنی ایسی لگ رہی تھی جیسے سیاہ آسمان میں تارے جھلملا رہے ہوں۔"

حویلی کا چوکیدار پونم کو پہچانتا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں، لیکن ہال کے اندر قدم رکھتے ہی کسی نے انھیں روک دیا۔ ٹھہرو لڑکی.... کیوں آئی ہو تم؟ ماں جی کی تیز آواز سن کر اجیت بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ پونم گھبرا کر لاجونتی کے پیچھے دبک گئی۔ تب ٹھاکر رنجیت سنگھ کی پتنی نے لاجونتی کو غور سے دیکھا...... دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور بیتے دنوں کا دھندلا سا عکس دونوں کی نگاہوں میں گھوم گیا.......

لاجونتی تم.......؟...... اجیت کی ماں نے اسے پہچان لیا تھا۔

ہاں! ٹھکرائن جی میں وہی ابھاگن لاجونتی ہوں۔ جو روز تمھیں پھولوں کا حسین گلدستہ اور گجرے بنا کر دیا کرتی تھی اور جسے بڑے ٹھاکر کے مہمان دوست، رام سنگھ نے آتم ہتیا کرنے پر مجبور کر دیا تھا....... جس نے ان کے ہی باغ کی رکھوالی کرنے والے مالی کے آنگن کی کلی کو مسل کر اس کا جیون اور گھر آنگن سونا کر ڈالا تھا....... اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ میں ایک نیچ ذات کی لڑکی ہوں اور وہ اعلیٰ خاندان کا ٹھاکر .... اس وقت اس نے نہ تو خاندان کے اصول کی پرواہ کی تھی اور نہ اسے سماج کا کوئی خوف تھا۔

کیونکہ میں اس کی نظر میں صرف ایک لڑکی تھی .... خوبصورت، جوان اور کنواری لڑکی .... اور جب ٹھاکر رام سنگھ نے مجھ نچلی ذات کی لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہوئے کوئی جھجھک، کوئی گھن نہیں محسوس کی تھی تو تم اسے اپنانے میں کیوں گھن محسوس کر رہی ہو.......؟

اس وقت بھی بڑے ٹھاکر نے میرا انصاف نہ کیا، باپو کو ہی کام سے نکال دیا کہ غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ باپو یہ دکھ سہہ نہ پایا۔

مگر میں مر کے بھی زندہ رہی کہ میرا غریب منگیتر شیام سندر نے سب جان کر بھی مجھے اپنا لیا اور آتم ہتیا نہ کرنے دی پھر پونم چاند بن کر ہمارے جیون میں آئی تو شامو نے اسے بہت محبت سے پالا اور مجھے بھی سمجھاتا رہا کہ اس بچی کا کیا قصور ہے؟ میری ممتا بھی اُمنڈنے لگی....... چند سال بعد شامو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو پونم ہی میرے جینے کا سہارا بن گئی اب میں اپنی بیٹی کو گھٹ گھٹ کر نہیں مرنے دوں گی.......

لاجونتی نے پونم کو کھینچ کر رنجیت سنگھ کی پتنی کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا۔۔۔ جان لو ٹھکرائن، اس کی رگوں میں وہی اعلیٰ ٹھاکر خاندان کا لہو دوڑ رہا ہے جو تمھاری رگوں میں ہے۔

اجیت نے یہ راز جان کر حیرت سے پونم کو دیکھا پھر اس کی آس بھری نظریں اپنی ماں کے چہرے پر جم گئیں.......

ٹھاکر رنجیت سنگھ کی پتنی کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو لرز رہے تھے یہ جان کر نہیں کہ پونم کے اندر ٹھاکر رام سنگھ کا لہو ہے .... بلکہ اس لیے کہ ایک عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور وہ بھی ایک عورت ہی تھی اور اس کے دکھ کو سمجھ رہی تھی پھر اجیت بھی تو یہی چاہتا تھا، اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا.......

لاجونتی! آج ہم ذات پات، اونچ نیچ اور اس ظلم کا پرائشچت کریں گے جو تمھارے ساتھ ہوا پھر وہ جھکیں اور پونم کو اپنے قدموں سے اٹھا کر اس کے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔

□□□

Mrs. Nilofar Parveen
Gachhi Tola
Ward no 24
Araria-854311(Bihar)

خوف

صاحبہ فردوس

کیوں ہورہا ہے میرے ساتھ ایسا؟ کس چیز کی کمی رہ گئی تھی میری پرورش میں؟ کیوں وہ اتنا بے حس ہوگیا ہے کہ اُسے اپنے ماں کے ساتھ ہورہی زیادتیاں نظر نہیں آرہی ہیں؟ اندھیرے کمرے میں بند، بستر پر لیٹی ہوئیں وہ خود سے ہم کلام تھیں۔

عہد گم گشتہ کے دریچے ہر رات کی طرح آج بھی کھل گئے تھے۔ وہ اُس وقت میں سفر کرنے لگیں جہاں خوشنما یادیں تھیں۔۔ مگر اُن خوشیوں کو اپنے اندر پنپ رہے خوف کے باعث وہ کبھی محسوس ہی نہیں کر پائی تھیں۔ اپنی اکلوتی اولادِ نرینہ اور خوشیوں کو خواہشوں کو نظر انداز کرتیں رہی اُس کی محبت کے بدلے اپنے بدصورت رویے سونپتی گئیں۔ وہ اب دھول، مٹی، گرد سے اٹا کمرہ وہ بھولنے لگیں تھیں اور اُس سنہرے دور میں چلیں گئیں جہاں ڈھیر ساری خوشیاں تھیں۔

☆☆☆

زمرد بیگم اور شہباز صاحب کی احمر اکلوتی اولادِ نرینہ تھی احمر کے بعد بھی تینوں بیٹیاں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ نور، اریحہ اور آئمہ، احمر اکلوتا تو ضرور تھا مگر اُسے کبھی وہ محبت وہ پیار اپنی ماں کی طرف سے نہیں ملا تھا جیسا عموماً مشرقی مائیں اپنے اکلوتے بیٹوں سے کرتیں ہیں۔ احمر کی بجائے زمرد بیگم کی ساری توجہ کا مرکز بیٹیاں ہی رہی تھیں۔

احمر ماں کی طرف سے خود کو نظر انداز ہوتا دیکھ کر اپنی جگہ اُداس ہوجایا کرتا تھا۔ اس لیے ماں کی نظروں میں آنے کے لیے خوب محنت کر کے اسکول میں فرسٹ آیا کرتا تھا اور ماں کے ہاتھ میں بڑے فخر سے ٹرافی تھما دیا کرتا تھا۔ مگر زمرد بیگم اُسے شاباشی دینے کی بجائے اُسے نصیحتیں دینے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ اُن کے برعکس شہباز صاحب اُسے گلے سے لگا کر اُس کا ماتھا چومتے اور اُس کی مزید کامیابیوں کی دعا کرتے۔

زمرد بیگم کا احمر کے ساتھ سرد رویہ دیکھ کر شہباز صاحب بھی حیران ہوجاتے ایک دن اُن سے رہا نہیں گیا تو وہ زمرد بیگم سے پوچھ بیٹھے۔

''زمرد بیگم! کیا بات ہے؟ تم احمر کی کامیابی پر خوش کیوں نہیں ہوتی ہو؟ کیا تمھیں فخر نہیں محسوس ہوتا؟'' شہباز صاحب کی بات پر زمرد بیگم دھیرے سے مسکرا اُٹھتیں اور کہتیں۔

''شہباز صاحب! ایسی کون سی ماں ہوگی جسے اپنے اکلوتے بیٹے کی کامیابی پر فخر نہیں ہوتا ہوگا۔ مجھے بھی خوشی ہوتی ہے فخر ہوتا ہے مگر بتول آپا کہتیں ہیں کہ اکلوتے بیٹوں کو ہمیشہ ان کی حد میں رکھنا چاہیے ورنہ بڑے ہوکر وہ اپنی من مانیاں کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچیں احمر ہمارا

اکلوتا بیٹا ہے ہماری ساری امیدوں کا چراغ۔ اگر ہم نے اُس پر ابھی سے سختی نہیں کی اُسے حد میں نہیں رکھا تو وہ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح ہمیں تنہا چھوڑ دے گا۔'' شہباز صاحب کو زمرد بیگم کی سوچ پر بہت افسوس ہوتا تھا وہ جانتے تھے اُن کا بیٹا جیسے ابھی فرمانبردار، سعادت مند ہے ویسے ہی بڑا ہو کر بھی رہے گا مگر زمرد بیگم کو کون سمجھاتا۔

''شہباز صاحب کی اپنی کپڑوں کی دکان تھی اس لیے گھر کے حالات ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔ شہباز صاحب نے اپنی چاروں اولاد کی تعلیم پر بہت زور دیا تھا۔ احمر کو انجینئرنگ کی پڑھائی کروائی اور بیٹیوں کو بھی اچھے اسکولوں میں پڑھایا۔ ایک سال کی تگ و دو کے بعد احمر کو ایک اچھی فرم میں جاب مل گئی تھی۔ پہلی تنخواہ ملی تو احمر نے تنخواہ میں سے دو ہزار روپے اپنے لیے نکال کر ساری تنخواہ ماں کے ہاتھوں میں دے ڈالا۔ اُس کی فرمانبرداری پر شہباز صاحب تو جی بھر کے خوش ہوئے بہنیں بھی بھائی کی سادگی پر خوش ہوئی تھیں مگر زمرد بیگم نے اُس پر اپنی دھاک قائم رکھنے کے لیے کہا۔''

وقت اپنے پیچھے، بہت سی چیزوں پر گرد کی تہہ جماتا ہوا بہت تیزی سے آگے بڑھتا گیا اور پیچھے انمٹ یادوں کو چھوڑتا گیا۔ کچھ موسم بہار کے آئے تھے اور کچھ خزاں کے اسی طرح زندگی کے ایام آگے سفر کرتے گئے۔

شہباز صاحب کی اپنی کپڑوں کی دکان تھی اس لیے گھر کے حالات ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔ شہباز صاحب نے اپنی چاروں اولاد کی تعلیم پر بہت زور دیا تھا۔ احمر کو انجینئرنگ کی پڑھائی کروائی اور بیٹیوں کو بھی اچھے اسکولوں میں پڑھایا۔ ایک سال کی تگ و دو کے بعد احمر کو ایک اچھی فرم میں جاب مل گئی تھی۔ پہلی تنخواہ ملی تو احمر نے تنخواہ میں سے دو ہزار روپے اپنے لیے نکال کر ساری تنخواہ ماں کے ہاتھوں میں دے ڈالا۔ اُس کی فرمانبرداری پر شہباز صاحب تو جی بھر کے خوش ہوئے بہنیں بھی بھائی کی سادگی پر خوش ہوئی تھیں مگر زمرد بیگم نے اُس پر اپنی دھاک قائم رکھنے کے لیے کہا۔

''تمھیں تو چالیس ہزار سیلری ملنا تھی یہ تو اڑتیس ہزار ہی ہے، باقی دو ہزار کہاں ہے؟'' وہ جو ماں کے منہ سے کچھ اور سننے کا منتظر تھا اُن کے یہ الفاظ سُن کر اُس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی اُس نے اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

''امی دوستوں کو ٹریٹ دینا تھی اس لیے دو ہزار اپنے پاس رکھ لیے۔'' اُس کی بات پر زمرد بیگم آگ بگولہ ہو گئیں اور بولیں۔

''میں یہ چونچلے بالکل نہیں برداشت کروں گی۔ تین تین بہنوں کی شادی کرنی ہے اور تم اپنے دوستوں کو مفت میں کھلانے پلانے کا سوچ رہے ہو۔'' پھر اُس کے ہاتھ سے دو ہزار بھی چھین لیے اور اپنے پاس رکھ لیے اُن کی اِس حرکت پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا بہنیں اور باپ بھی زمرد بیگم کو ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگے تھے۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تینوں بیٹیوں کو شہر میں ہی اچھے گھرانوں میں بیاہنے کے بعد احمر کی باری آئی تھی۔ وہ احمر کے لیے لڑکی اپنے رشتے داروں میں سے لانا چاہتیں تھیں تاکہ بہو پر بھی زندگی بھر دھاک جمی رہے۔ اس سے پہلے کہ وہ احمر سے اُس کی شادی کی بات کرتیں احمر نے ایک دن خود ہی آ کر اُنھیں اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

''امی! میں نے اپنے لیے انابیہ کو پسند کیا ہے، وہ میرے ساتھ آفس میں جاب کرتی ہے۔ آپ پلیز اُس کے گھر میرا پرپوزل لے جائیں۔'' احمر کی یہ بات سُن کر تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئی تھیں۔ اپنے سارے خوف اندیشے اُنھیں اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے نظر آئے تھے تب ہی وہ بولیں۔

''مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوئیں لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔ جو آفس میں کام کرنے کے لیے کم اور مردوں کو رجھانے کے لیے زیادہ جاتی ہیں۔ میں تمھارا پرپوزل لے کر اُدھر بالکل بھی نہیں جاؤں گی۔'' قطعیت سے کہتے ہوئے زمرد بیگم نے اپنے تئیں بات ہی ختم کر دی تھی۔ اُن کی بات پر وہ بہت دلبرداشتہ ہوا تھا تب ہی ایک بار پھر اُنھیں منانے کی سعی کرتا ہوا بولا۔

''امی پلیز مان جائیں میں نے انابیہ سے وعدہ کر رکھا ہے۔'' زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی ماں سے کسی چیز کی خواہش کی تھی مگر اُس کے جذبات کو نہ سمجھتے ہوئے زمرد بیگم گھڑیال آنسو بہاتے ہوئے بولیں۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم نے خود ہی لڑکی بھی پسند کر لی اُس سے وعدہ بھی کر لیا اور مجھے اب بتا رہے ہو؟ اگر تم نے مجھے پہلے ہی اپنی پسند سے

آگاہ کردیا ہوتا تو میں ثمینہ سے رابعہ کا رشتہ کبھی نہیں مانگتی۔ یہ تم نے کیا کردیا احمر مجھے سارے خاندان کے سامنے شرمندہ کردیا۔

اب میں ثمینہ کو کیا منہ دیکھاؤں گی۔'' ثمینہ اُن کے دور پار کی کزن تھی اور رابعہ اُن ہی کی بیٹی تھی ۔واجبی شکل وصورت کی مالک رابعہ ایف۔اے پاس تھی۔

اُسے اپنی پسند سے دستبردار کروانے کی خاطر زمرد بیگم نے جھوٹ کہہ دیا تھا۔اوراُن کے اِس جھوٹ کو سچ سمجھ کروہ اُن کی بات پر ایمان لے آیا اور رابعہ کے لیے مان گیا۔اُس کی فرمانبرداری پر ہمیشہ کی طرح زمرد بیگم کا سیروخون بڑھ گیا پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کرکے رابعہ اُن کے آنگن میں اُتر آئی۔تینوں بہنوں اور شہباز صاحب نے پہلے پہلے رابعہ کے خوب نازو نخرے اُٹھائے تھے مگر زمرد بیگم کو لگتا تھا زیادہ ناز نخرے اُٹھائیں گیں تو سر پر چڑھ جائے گی۔اپنے اندر کے خوف کے باعث رابعہ کو زیادہ منہ نہیں لگایا تھا۔ بلکہ وہ ہر وقت اُس پر حکم چلایا کرتیں تھیں۔رابعہ نے کچھ دن تک تو اپنی ساس کا رویہ برداشت کیا مگر پھر وہ بھی اپنی اصلیت پر اُتر آئی تھی۔دونوں کے درمیان ہر روز کی بحث وتکرار پر شہباز صاحب ہمیشہ زمرد بیگم کو ہی ٹوکا کرتے تھے کیونکہ غلطی ہمیشہ زمرد بیگم کی ہوا کرتی تھی مگر وہ مانتیں نہیں تھیں۔احمر جو ہمیشہ سے خاموش طبع تھا اُن کی کشا کشائی پر وہ بھی لب بستہ رہتا تھا۔

گھر میں خوشیوں کی لہر سی اُٹھ گئی تھی جب احمر اور رابعہ کے آنگن میں پھول سی بیٹی پیدا ہوئی مگر یہ خوشی زیادہ دن قائم نہیں رہ سکی تھی۔وقت نے ایسی کروٹ لی کہ شہباز صاحب دل کا دورہ پڑنے کے باعث اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔شہباز صاحب کے جانے کے بعد زمرد بیگم کا وہ ٹھاٹ باٹ رعب ودبدبا نہیں رہا تھا سارے گھر پر اب رابعہ کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی۔اُس نے بھی اگلے پچھلے تمام حساب برابر کرتے ہوئے اُنھیں اپنے روم تک ہی محدود کردیا تھا۔کسی بھی چیز میں اُن سے صلاح مشورہ لینا ترک کردیا تھا۔احمر پر دو اور دو چار کرنے کی دھن سوار تھی اس لیے اسے گھر کے حالات کی بالکل بھی خبر نہیں تھی۔وقت نے زمرد بیگم کو کیا سے کیا بنادیا تھا وہ ہر زور احتساب کرنے بیٹھ جاتیں اور سوچنے لگتیں کہ غلطی کہاں ہوئی تھی۔

آج بڑے دنوں بعد نور گھر آئی تھی اپنے حالات اور احمر کے رویے سے پریشان زمرد بیگم اُس سے شکایت کرنے بیٹھ گئیں۔

''دیکھوں ناں نور! احمر کس قدر بدل گیا ہے، میرا فرمانبردار بیٹا کتنا لاپرواہ اور بے حس ہوگیا ہے۔پتا نہیں اُس رابعہ نے اُسے کیا گھول کر پلا دیا کہ اُسے ماں نظر ہی نہیں آتی ہے، ایک بھی بار کمرے میں جھانک کر نہیں دیکھتا ہے۔اور اِس کمرے کو ہی دیکھو کس قدر دھول مٹی میں اٹا پڑا ہے مگر مجال ہے جو ملازمہ سے کہہ کر میرا کمرہ صاف کرواتی ہو۔'' اُن کی بات پر نور نے ناقدانہ نظریں اُن کے روم پر ڈالی واقعی اُن کے روم کی حالت کافی بُری ہوچکی تھی۔ ہر چیز گرد وغبار سے اٹی پڑی دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔اُس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ کر گئی تھی تب ہی وہ بولی۔

''امی ساری غلطی آپ کی ہے۔آپ نے بھائی پر اپنی دھاک جمانے کے لیے ان کی ساری خوشیوں کو پس پردہ ڈال کر صرف اپنی من مانیاں کی ہیں۔اُنھوں نے پہلی بار کوئی خواہش کی تھی وہ بھی آپ نے بری طرح رد کردی تھی۔آپ کے اندر ایک خوف تھا جو آپ کی زبان پر تو نہیں آتا تھا مگر آپ کی آنکھوں میں ضرور نظر آتا تھا۔آپ نے بھائی کی پوری زندگی اُس ہی خوف کی نذر کردی اور شکوہ بھی خود کر رہی ہیں۔کیا ہوجاتا جو آپ بھائی کو اُن کے حصے کا پیار دیتیں اُن کے حصے کی خوشیاں دیتیں۔اب وہ خود سے اور ساری دنیا سے لاپرواہ ہوگئے ہیں۔اُنھیں اب اپنی کوئی پرواہ نہیں رہی ہے پھر وہ کیسے اپنے اردگرد کی پرواہ کرسکتے ہیں۔امی جانتی ہوں آپ بھائی سے بہت محبت کرتیں ہیں بس اُنھیں کبھی اپنی محبت کا احساس نہیں دلایا ہر رشتہ محبت واحساس مانگتا ہے اور آپ نے ہمیشہ بھائی کو اپنی مامتا کے احساس سے نابلد رکھا۔''

نور کی بات پر زمرد بیگم کو پچھتاوے کے ناگ ڈسنے لگے تھے۔ اُن کے اندر کا خوف اُن کے بیٹے کو اُن سے دور لے گیا تھا اور اب وہی خوف اُن کی ساری زندگی پر حاوی ہوچکا تھا۔ماضی کی بہت ساری باتیں، بہت ساری یادیں اُن کا دھیان اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں اور وہ اُن سے نظریں چرالیا کرتیں تھیں۔کبھی کبھی ہم خود ہی اپنے ہاتھوں درد کا سودا کر بیٹھے ہیں اور ہمارے کیے گئے غلط فیصلے ہمیں زندگی بھر پچھتاوے میں مبتلا کردیتے ہیں۔

□□□

MS. Saheba Firdous
D/o, Mohammad Ismail
Vill. Anjan Gaon
Surji Shaniwara Peth,
Near Alam Chowk
Distt.Amravati-444705 (M.S)

ڈاکٹر مسرور صغریٰ

اے میرے وطن

اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

تجھ سے ہی بہاریں چاروں طرف تیری ہی وفائیں عزّ و شرف
تجھ سے ہی ہمارا دل ہے صدف تو ہی ہے سلف تو ہی ہے خلف
تیری ہی وفا کا دل ہے حدف تیری ہی زمیں کے ہم ہیں خذف
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

کاشی میں ترے ہے راز کوئی متھرا میں تری ہے ساز کوئی
شرڈھی کی کہیں آواز کوئی اجمیر سا ہے ممتاز کوئی
کشمیر کا ہے انداز کوئی ہردوار پہ ہے پرواز کوئی
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

تیرا یہ ترنگا ایسا علم جس پر ہے خدا کا خاص کرم
تو ہی ہے ہمارے دل کا بھرم تجھ سے ہی ہیں خوشیاں ہم کو بہم
تو ہی ہے جہاں میں اپنا صنم سینے میں ترا ہے نقشِ قدم
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

داتا سے ہے اپنی ایک دعا دنیا میں رہے یوں نام ترا
تو کرتا رہے بس مہر و وفا تا حشر رہے بس تیری صدا
ہر پل ہے بہاروں کی یہ ندا چلتی ہی رہے اب تیری ہوا
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

یہ کیسا ہمالہ شیش ترا جس پہ ہے فلک بھی جاں سے فدا
گنگا کی مقدس آب و ہوا کرتی ہے ترے گن گان سدا
جمنا کی اداؤں کی بھی ضیا دھرتی پہ تری ہے رب کی عطا
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

دامن ہے ترا رنگین و حسین تجھ سا ہے جہاں میں کوئی نہیں
تو ہی ہے ہماری خلد بریں دلکش ہے ترے خوابوں کی زمیں
تو ہی ہے زمیں کا ماہ مبیں تنویر تری ہے عرش نشیں
اے میرے وطن اے میرے چمن تجھ پر یہ نچھاور جان مری
تو میری صدا تو میری انا تو ہی ہے فقط اک شان مری

Dr. Masroor Soghra
Assistant Prof. (Guest Faculty)
C M College
Quilaghat, Rahamganj,
Darbhanga-846004 (Bihar)

فرحانہ نازنین

اس دل کی الجھتی ہوی ڈور ہی کھو لوں
رونے کے لیے آنکھ. میسر ہے تو رو لوں

یہ ذہن تری سوچ سے پلٹا ہی نہیں ھے
کرنے کو اگر بات کوئی ہو تو میں بولوں

بکھرے ہیں جہاں بھر میں کئی رنگ خوشی کے
فرصت ہو میسر تو انھیں ہاتھ سے چھو لوں

جا چھوڑ دے پیچھا مراا ے گردشِ دوراں
کتنا ہے ستمگر تجھے زخموں سے میں تو لوں

یادوں سے کہاں وقت گذشتہ ہے پلٹتا
اب تو یہی ممکن ہے کہ میں خاک پہ سو لوں

شناخت

زندگی کے طویل مسافرت میں
اپنا ہی چہرہ تلاشتی
ہوں میں
خود سے بچھڑی ہوں
کب،!؟ کہاں،!؟ نا معلوم
کیوں ہر طرف
خود کو ڈھونڈھتی ہوں میں
آزمائش ہے خود سے ملنا بھی
ایک خواہش ہے
ناتمام سی یہ
اور خواہش کا کیا ہے
بنتی ہے
جیسے زد پہ ہوا کہ
کوئی دیا
لو بھڑکتی بھی ہو تو
بجھتی ہے!
پھر بھی
یہ پیاس کیسی ہے میری
دھڑکنیں بن کے
کیوں دھڑکتی ہے

Farhana Nazneen
C/o. Afsar Imam
Mobilevision, Shahadat Market
Head Post Office
Kachahari Road
Begusarai, 851101 (Bihar)

سلمیٰ حسین

لذیذ پکوان

اچار، چٹنی اور مربا

ان تینوں کا عجب ساتھ ہے۔ دو چٹ پٹے اور ایک میٹھا۔ پھر بھی ساتھ ہی کھلائے جاتے ہیں۔

ہندوستانی کھانوں میں اچار چٹنی کا اہم کردار ہے۔ ہر صوبے میں ان کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔ شکل بدجاتی ہے نام بدل جاتا اور ذائقہ بھی۔ ہندوستان کا جنوبی حصہ اچار اور چٹنیوں کے بنانے میں صف اول میں ہے۔ کرناٹک کی پرانی کتابوں میں ان کا ذکر خوب ملتا ہے۔ ہندوستان کے مرکزی صوبے کلیانا کے راجا سومیشور کھانے پینے کے شوقین تھے۔ 1130 میں انھوں نے مانا سولا سا لکھی جس میں شاہی مطبخ میں تیار کی جانے والی غذاؤں اور خاص طور پر چٹنی اچار کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں: ''چٹنی غذا کو چٹ پٹا بناتی ہے اور اچار تیکھا پن'' دہی، پلوں کے رس، مسالحہ جات اور تیل کو ہلکی آنچ پر پکا کر بطور چٹنی استعمال کیا جاتا تھا۔ چاول پر خمیر آجانے کے بعد ہند جنوبی بطور چٹنی بڑے شوق سے کھایا جاتا تھا لیکن اب ناپید ہے۔

16 صدی میں لکھی پدماوت میں شاہی ضیافتوں میں کئی طرح کی چٹنی اور اچار کی شمولیت کا ذکر ہے۔ نارنگی کے رس اور کھانے والے کپور کے امتزاج سے بنی چٹنی کا ذکر کافی دلچسپ ہے۔ ان کتابوں میں چٹنی بنانے کے مختلف طریقوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ بنا پکائے، پانی میں ابال کر، تیل میں پکا کر، بنا تیل یا پانی کے، آگ پر پکا کر۔

ان تمام تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ چٹنی اور اچار زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مروج ہیں۔ ان کا ساتھ اٹوٹ ہے۔ مغلیہ سلطنت نے جہاں کھانوں کو ایک فن کی صورت دی چٹنی بھی ان کی دلچسپی سے بچ نہیں پائی۔

ابوالفضل آئین اکبری میں انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ چٹنی، اچار اور مربوں کا بھی مفصل بیان کرتے ہیں۔ اب چٹنی ترکاریوں کے علاوہ تازہ پھلوں میں بھی بننے لگی اور ساتھ ہی خشک میوؤں کے استعمال نے اسے ایک نیا ذائقہ دیا ہے بادشاہ کے خاصے میں چٹنی، اچار اور مربے کے پیالے سرخ مہین کپڑوں سے ڈھکے بڑی نفاست سے حاضر کیے جاتے تھے۔ چٹنی آج بھی خاتون خانہ گھروں میں بنا لیتی ہیں لیکن سپر مارکیٹ میں بھی نت نئے چٹنیوں کے پیکٹ گاہکوں کو للچاتے ہیں۔

یہ تو رہا چٹنی کا ذکر اب اچار کی کہانی بھی گوش گزار ہے۔

اچار ڈچ لفظ پے کل یا جرمن لفظ پوکل سے بگڑ کر Picle بن گیا Hobson Jobson اسے پرتگالی طبیب کا ایجاد کردہ لفظ بتاتا ہے۔

اچار ہندوستان کی سرزمین میں سالہا سال سے موجود ہے۔ تقریباً 4 ہزار سال قبل۔ کرناٹک کی ایک کتاب جو 1594 میں لکھی گئی انواع و اقسام کے اچار کا ذکر کرتی ہے۔ اچار اصلاً سردیوں کے لیے محفوظ غذا تھی۔ طویل دریائی سفر کا ساتھی تھی۔ پھلوں اور ترکاریوں کو دھوپ میں خشک کیا جاتا تھا پھر نمک یا Brine میں ڈبو کر بڑے بڑے مرتبانوں میں کسی اندھیری گرم جگہ رکھ دیا جاتا تھا۔ کئی ہفتوں میں جب خمیر اٹھ جاتا تو ٹھنڈے کمرے میں منتقل کر محفوظ کر لیا جاتا تھا اور سردیوں میں بر سر کار آتا تھا۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں اچار سے متعلق دلچسپ حکایتیں ملتی ہیں۔ بائبل میں اس کا ذکر ہے۔ ارسطو اسے تندرستی کا راز بتاتے ہیں۔ نپولین اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ قلوپطرہ کی خوبصورتی کا مددگار ہے اور ولیٹ شیکسپیئر کے ڈراموں میں بھی اشارتاً موجود کہتے ہیں تیرھویں صدی کے بادشاہ جون John کی ضیافت میں اچار بطور غذا مجود تھا۔ جارج واشنگٹن کی میز پر 476 قسم کے اچار موجود رہتے تھے۔ الغرض چٹنی کی طرح اچار نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔

مربا چٹنی اور اچار کا ساتھی ضرور ہے لیکن مقابلتاً مزاج، ذائقہ اور شکل وصورت میں مختلف۔

مربا وسط ایشیا سے مغلوں کے ہمراہ ہندوستان پہنچا اور یونانی طبیبوں کے ہاتھوں صفت وتندرستی کا اہم آلہ کار بن گیا۔ وسط ایشیا میں چائے کی میز پر مربے کے خوبصورت مرتبان نہ صرف دلفریب نظر آتے ہیں بلکہ خوش ذائقہ، خوش دیدنی اور مفید بھی ہوتے ہیں۔ آذر بائیجان اور وسط ایشیا کے ہمجوار علاقوں میں پھلوں اور ترکاریوں سے بنے مربے سردی، زکام کا بہترین علاج ہیں۔ ترکی میں مربا بنانے کے الگ شعبے ہیں جہاں تازہ پھل کے رس کو گاڑھا کر دھوپ میں خشک کرنے کے بعد سال بھر کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ وسط ایشیا اور مشرقی وسطیٰ میں پھلوں کی کثرت ہے اور موسم ختم ہونے سے قبل ان کو مربے کی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ یہ مربے صبح کے ناشتے اور شام کی چائے کے ساتھی ہیں۔

ہندوستان میں مغلوں نے مربوں کو عام کیا اور ہندوستان کے کوہستانی علاقوں میں جہاں پھل بکثرت پائے جاتے ہیں مربوں کا رواج عام ہوا۔ پھل کے ساتھ ترکاریوں کے مربے بھی بنائے جانے لگے۔

آذر بائیجان میں ہر سال اگست کے مہینے میں بین الاقوامی مربا فیسٹی ول منعقد ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا 2013 میں ہوئی اور اب بڑی کامیابی سے یہ جشن آذر بائیجان کے کوہستانی علاقے قبالا میں منایا جاتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس جشن کا لطف اٹھاتے ہیں اور انواع و اقسام کے مربوں کا ذائقہ لیے واپستی جاتے ہیں۔ یہ جشن ہر سال آذر بائیجان کی وزارت، سیاحت، ترکی، روس، ایران، کرگستان او رہمجوار علاقے اس جشن میں شرکت کرتے ہیں۔ ان کے پیش کیے مربوں کی قضاوت معتبر اشخاص کے سپرد ہوتی ہے جو مربوں کے بنانے کی تکنیک، رنگ، ذائق اور پیش کرنے کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے جوائز اعلام کرتے ہیں۔ سال گذشتہ تقریباً 20 ہمجوار ممالک نے شرکت کی گن جا علاقے کا پیش کردہ اسٹرابیری کا مربا جائزہ کا حقدار بنا ساتھ ہی بالکن کا بنا لیموں کے پھول کا مربا۔ بادام اور سفید کدو کا مربا بھی کافی مقبول ہوا۔ گرم مربے کو آئس کریم پر ڈالیے۔ ناشپاتی یا انجیر اوپر رکھ اس کا لطف اٹھائیے۔

مربوں کا جشن اپنی نوعیت کا اچھوتا اور بے مثالی جشن ہے جو موسمی پھلوں کی اہمیت کو بڑھتا ہے اور ان کے استعمال کے طریقوں سے عام آدمی کو روشناس کرتا ہے۔ ان مربوں کا استعمال کیک، پیٹری بنانے میں بھی کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر میں مربا دنیا بھر میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے اب گھروں میں بنانے کا رواج تو قصۂ پارینہ ہے لیکن ہر جگہ دکانوں پر بنے بنائے مربوں کے ڈبے مل جاتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ صنف کافی آگے بڑھ چکی ہے اور لوگ اس کے فوائد سے بھی آگاہ ہیں۔

ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید کا کہنا تھا۔ ایک چائے کا چمچہ آنولے کا مربا نہار منھ کھائیے کبھی کسی ملٹی وٹامن کی ضرورت نہ ہوگی۔

بس آپ بھی مربا کھانے کی عادت ڈالیے اور صحت مند رہیے۔

□□□

Salma Y. Husain
E-52, G.F. Society
Sect-54
Gurgaon-122002 (Haryana)

صحت

ہمارا جسم اور غذا کی اہمیت

شکیل احمد

انسان کا جسم ایک کثیر الخلیاتی حیاتی نظام ہے جس کی ابتدا خورد بین سے نظر آنے والے ایک خلیہ سے ہوتی ہے۔ جسم مختلف اعضا پر مشتمل ہے اور اس میں ٹھوس اور سیال دونوں مادے پائے جاتے ہیں۔ جسم میں انتہائی سخت اعضا مثلاً دانت ، ہڈی، کھوپڑی بھی ہیں اور ہتھیلیاں، پنڈلیاں، دل گردہ، جگر جیسے نرم اعضا بھی ہیں۔ سیال مادے جیسے خون، لمف اور دوسرے رقیق بھی جسم میں موجود ہیں۔ انسان کے اعضا کے کام مختلف ہونے کے باوجود یہ بنیادی طور پر خلیوں کے ہی بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کے مختلف مراحل پر یہ خلیے ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ خراب خلیوں کا جسم سے اخراج، ان کی مرمت اور نئے خلیوں کی ساخت ہی انسان کی فطری زندگی ہے۔ یہ خلیے چونکہ کھانے میں موجود اجزا سے مل کر بنتے ہیں اس لیے خلیوں کی صحیح مرمت اور نئے خلیوں کی تعمیر کے لیے مناسب غذا بہت ضروری ہے یہ بتانے سے قبل کہ کس طرح غذا سے خلیوں کی نشو و نما ہوتی ہے ہمیں خلیوں کی بناوٹ کا علم ہونا ضروری ہے۔

خلیہ حیات کی اکائی ہے۔ یہ مندرجہ ذیل ساخت پر مشتمل ہے۔

باہری خلوفی غشا (Cell Membrane)، اندرونی خلیہ (Nucleus) اور بہت سے چھوٹے اجزا جن کو طاقتور خورد بین کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ برقی خورد بین کی مدد سے ، باریک نلیوں کا جال درون مشبک مایہ (Endoplasmic reticulum) مائی ذرات (mitochondria) اور بہت سے چھوٹے اور وزنی ذرات جو اندرون مایہ میں پائے جاتے ہیں ان کی دریافت ممکن ہو سکی ہے۔ خلیہ کی دیوار دوہری ہوتی ہے۔ خلیوں کے اجزا جن کو سائنسی ٹیکنک کے ذریعہ الگ کیا جا سکتا ہے ان کے کام بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ نیوکلیس تولیدی نظام کی نگرانی اور خلیوں کی تضعیف Duplication میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ رائبوسوم (Ribosome) پروٹین کے بننے میں مدد کرتے ہیں۔ مائٹو کانڈریا کی مدد سے اڈی نوسن ٹرائی فاسفیٹ (A-T-P) کی تخلیق ہوتی ہے جس سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ درون مشبک مایہ کی شحمی سطح پر کچھ غیر قطبی سالمات (Non Polar Molocules) ہوتے ہیں۔ خلوی غشا کے ذریعہ خلیہ کے اندر اور باہر الکٹرو لائٹس (Electrolytes) کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اس کے ذریعہ خلیوں کے اندر موجود مادہ حیات میں غذا پہنچتی ہے۔ مایہ حیات میں سیکڑوں انزائم (Enzyme) ہوتے ہیں جو خلیوں میں ہونے والے کیمیاوی عمل میں مدد کرتے ہیں جس سے خلیوں میں پہنچتی ہوئی غذا ان کا جزو بنتی ہے۔ خلیوں کے جملہ کیمیاوی عمل کو زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

خلیے خون کے ذریعہ فراہم ہونے والی غذا کو اپنے تئیں کام میں

لاکر کیمیاوی مادوں کو جسم کے اجزا میں تبدیل کرتے ہیں۔خلیوں کے ذریعہ نیوکلیک ایسڈ، پروٹین، شحمیات اور دیگر کلاں سالمات کی تخلیق ہوتی ہے۔خلیوں کی ترتیب سے نسیج اور بالآخر عضلات کی تعمیر ہوتی ہے مختلف اعضا میں الگ قسم کی پروٹین ہوتی ہے۔ یہ اختلاف پروٹین میں امینو ایسڈ کی قسم، اعداد وشمار اور انداز ترکیب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ انسان کو اس ترتیب کے سلسلہ میں کوئی کاوش کرنا نہیں پڑتی۔جسم میں قدرتی مشینیں چل رہی ہیں جو خود بخود غذا کو ضرورت کے مطابق تبدیل کر کے عضو مخصوص کا جز بنا دیتی ہیں۔اس سے غذا کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہم صرف غذا کے بارے میں تھوڑا محتاط ہو جائیں تو ہمارا جسم خود بخود توانا، صحت مند اور امراز سے پاک ہو جائے۔

بدن میں ہڈیوں کی ساخت کو ایکسرے کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر تغذیہ ناقص ہے تو ہڈیاں ٹھیک نہیں بنیں گی۔اس لیے بچوں کو اچھی خوراک، دودھ، وٹامن ڈی اور مچھلی کا تیل دینا چاہیے۔ دانتوں کا صحیح بننا اور ان کی مضبوطی بھی غذا پر منحصر ہے۔

ملائم نسیجوں اور عضلات کی تعمیر بھی غذا پر منحصر ہے۔جس کی کھال کے نیچے چربی کی تہہ اگر اچھی ہے جس کا اندازہ کھال کے اوپر سے ہو جاتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ غذا میں ضرورت کے مناسب توانائی والے اجزا مل رہے ہیں۔ چربی کی تہہ اگر بہت پتلی ہوتی ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ غذا میں توانائی دینے والے اجزا کی کمی ہے۔ بہت موٹی چربی چڑھ جانا بھی خطرناک ہے کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ضرورت سے بہت زیادہ توانائی کی غذا ہم کھا رہے ہیں جس سے بیماریوں کا اندیشہ ہے۔عضلات کی ساخت اور مضبوطی سے ملی خوراک کی غذائیت کا اندازہ ہوتا ہے۔اچھی اور مناسب غذا عضلات کی نشو نما، مضبوطی اور کام کرنے کی استعداد کو بڑھاتی ہے۔خون میں اچھی غذا کے اجزا کی شمولیت سے پورے جسم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔خون جسم کا ایک متحرک جز ہے جو مختلف حصوں میں غذا کو پہنچاتا ہے۔نسیجوں میں غذا کا پہنچنا خون میں موجود غذا پر منحصر ہے۔

جسم کے عضو، ہڈی، دانت، چربی، عضلات اور خون وغیرہ کی ساخت جہاں غذائی حالت کو الگ الگ طور پر ظاہر کرتے ہیں وہیں ان سب اعضا کی اجتماعی صحت سے آدمی کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر آدمی کو بچپن سے اچھی غذا مل رہی ہے تو اس کا جسمانی ڈھانچہ اچھا ہوگا۔ ہاتھ اور پیر لمبے اور سیدھے ہوں گے۔ دانتوں اور جبڑوں کی بناوٹ بھی اچھی اور مضبوط ہوگی۔ ہڈی سے منسلک عضلات میں مناسب مقدار میں چربی ہوگی جس سے جسم سڈول اور خوبصورت ہوگا۔جس میں امراض سے مدافعت کی قوت ہوگی۔ ایسے لوگ ذہین، ہوشیار، چاق و چوبند اور خود اعتماد بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب اچھی غذا کے نتائج ہیں۔

تشریح:

مائی ذرات ......تکسیدی عمل کی جائے وقوع ہے جس سے خلیہ کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں اڈینوسن ٹرائی فاسفیٹ(ATP) کی ترکیب ہوتی ہے۔

درون مشبک مایہ (Endoplasmic reticulum) ۔ یہاں اسٹرائیڈ کی ترکیب اور استحالہ ہوتا ہے جس سے اسٹرال (خصوصاً کلوسٹرال) پت (بائل ایسڈ)، ہارمون (مذکر اور مونث دونوں جنس)، اڈرینل کارٹیکو اسٹرائڈ وٹامن ڈی، سیپونین کارڈیک گلائیکوسائیڈز جیسے ضروری اجزا کی ساخت اور نگرانی ہوتی ہے۔

رائبوسوم بھی درون مشبک مایہ میں ہوتا ہے اور پروٹین کی کیمیائی ترکیب میں مدد دیتا ہے۔

(ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، تیسری طباعت 2010)

حسن کی نگہداشت

چہرے کو نکھارنے کی ٹِپ

گرمی کے موسم میں اکثر خواتین کا رنگ دھوپ میں باہر نکلنے اور دھول مٹی کی وجہ سے بہت خراب ہو جاتا ہے، چہرے پر سورج کی تیز شعاعوں کی وجہ سے گہرا رنگ آ جاتا ہے اور یوں خوبصورتی باقی نہیں رہتی۔

ایسے میں پریشان نہ ہوں ۔ چہرے کی رنگت نکھارنے کی ایسی ٹِپ کہ ایک بار کے استعمال سے ہی آپ کا رنگ کافی گورا ہو جائے گا اور اگر آپ مستقل استعمال جاری رکھیں گے تو بے حد نکھری رنگت پائیں گے۔

بیوٹی ٹِپ کے اجزا: گلاب کی پتیاں: 8 سے 10 عدد، ایلو ویرا جیل: ایک چمچ، گلیسرین: 2 سے 3 ڈراپ، ایون وٹامن ای کیپسول: 2 عدد

لگانے کا طریقہ: گلاب کی پتیوں کو گرینڈر میں عرقِ گلاب ڈال کر پیس لیں، اب گلاب کی پتیوں کے پیسٹ میں ایک چمچ ایلو ویرا ڈالیں، 2 سے 3 ڈراپ گلیسرین ڈالیں، 2 عدد وٹامن ای کے کیپسول توڑ کر ڈالیں، اور اس کو اچھے سے مکس کر کے چہرے کو دھو کر یہ پیسٹ لگا لیں، یہ پیسٹ رات کو سوتے وقت روزانہ لگائیں اور صبح اُٹھ کر چہرہ دھولیں بہترین نتائج ملیں گے۔

ٹِپ: اسے روز رات استعمال کرنے سے 15 دن میں رنگ بہت صاف ہو جائے گا۔

اس کے استعمال سے چہرے پر قدرتی نکھار اور شادابی آئے گی۔

اگر آپ کہیں ارجنٹ جا رہے ہوں تو اسی پیسٹ میں تھوڑا سا بیسن شامل کر کے مساج کر لیں اور دھو کر عرقِ گلاب چھڑک لیں فوری رزلٹ پائیں گے یہ ارجنٹ فیشل کے طور پر کام کرے گا۔

یہ مکسچر بنا کر 15 دن کے لیے فریج میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

شامل اجزا کے فوائد:

گلاب کی پتیاں: گلاب میں قدرت نے بہت سے خوبصورتی کے جُز شامل کیے ہیں یہ جلد کو نکھارتا ہے جان دار بناتا ہے گلابی رنگ دیتا ہے اور تروتازہ کرتا ہے۔

ایلو ویرا: ایلو ویرا اینٹی بیکٹیریل ہے یہ داغ دھبوں اور دانوں کو دور کرتا ہے چہرے کی رنگت کو نکھارتا ہے، سورج سے پڑنے والی تیز شعاعوں کا اثر ختم کرتا ہے۔

گلیسرین: گلیسرین کے فوائد کون نہیں جانتا، یہ ایک قدرتی موسچرائزر ہے یہ اسکن کو سافٹ بناتا ہے، جلن دور کرتا ہے اور خشک جلد کو نرم و ملائم بناتا ہے۔

وٹامن ای کیپسول: وٹامن ای جلد کے لیے بہترین غذا ہے یہ جلد سے وٹامن کی کمی پورا کر کے سیلز کو دوبارہ زندہ کرتا ہے یہ ڈیڈ اسکن سیلز کا خاتمہ کر کے چہرے پر قدرتی رونق بحال کرتا ہے۔

ہاتھوں کی جھریاں ختم کرنے کے آسان گھریلو ٹوٹکے

انسان کے ہاتھوں سے اس کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ ہماری عمر بڑھنے کا اثر سب سے پہلے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

آیئے آپ کو ایسے نسخے بتاتے ہیں جس کے استعمال سے آپ کے ہاتھ خوبصورت ہونے کے ساتھ نوجوانوں کی طرح لگنے لگیں گے۔ جن لوگوں کی جلد بوڑھی لگتی ہے انہیں یہ نسخہ ضرور آزمانا چاہیے اور جو لوگ اپنے ہاتھوں کو خوبصورت رکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

انڈے: ایک کھانے کا چمچ اور انڈے کی سفیدی لے کر مکس کریں اور اس آمیزے کو اپنے ہاتھوں پر لگائیں۔ خشک ہونے پر ہاتھ دھولیں، اس کی وجہ سے ہاتھوں کی نمی برقرار رہے گی اور جلد خوبصورت ہوگی۔

آلو: اس کی وجہ سے آپ کے ہاتھ نرم و ملائم ہو جائیں گے۔ کچھ آلو اُبالیں اور اُبلنے کے بعد پیس لیں، اب اس میں ایک بڑا چمچ زیتون کا تیل، شہد اور دودھ ملائیں اور اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اس آمیزے کو فریج میں رکھیں اور ہفتے میں تین بار اسے ہاتھوں پر لگا کر 15 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ کچھ ہی ہفتوں میں آپ کو واضح فرق نظر آئے گا۔

لیموں اور چینی: آدھے لیموں کا رس نکال کر اس میں دو بڑے چمچ چینی کے ڈالیں اور حل ہونے پر ہاتھوں پر لگائیں۔ خشک ہونے پر ہاتھوں کو صابن سے دھولیں

بادام کا تیل: رات کو سوتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو بادام کے تیل میں ڈبوئیں اور اس کے بعد پانچ منٹ تک ٹھنڈے پانی میں رکھیں۔ اب کوئی گریس کریم لگائیں اور کاٹن کے دستانے پہن کر سو جائیں۔ اگلی صبح آپ کے ہاتھ نرم و ملائم ہو چکے ہوں گے۔

پیٹرولیم جیلی: رات کو سوتے ہوئے اپنے ہاتھوں پر پیٹرولیم جیلی لگائیں اور کاٹن کے دستانے پہن لیں۔ اگلی صبح آپ کے ہاتھ نرم ہو جائیں گے۔

بالوں کی سفیدی کا باعث بننے والی غذائیں

ہر ایک کو اس کا سامنا ہوتا ہے اور متعدد افراد تو سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپے اسے چھپانے میں لگا دیتے ہیں اور وہ ہیں سر کے سفید بال۔

سفید بال بڑھاپے کی واضح علامات میں سے ایک مانے جاتے ہیں مگر ہر ایک انہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا خاص طور پر اگر وہ قبل از وقت نمایاں ہونا شروع ہو جائیں۔

اگر آپ کے بالوں میں چاندی جوانی میں ہی نمودار ہونے لگی ہے تو اس کی وجہ آپ کی غذا بھی ہو سکتی ہے۔

جی ہاں کچھ غذائیں بالوں میں سفیدی کو قبل از وقت نمودار کر دیتی ہیں۔

چینی: چینی کا بہت زیادہ استعمال بالوں کو بہت تیز رفتاری سے سفید کر سکتا ہے، اگر آپ کو چینی سے بنے پکوان کھانا بہت پسند ہیں تو بالوں کی سفیدی نمودار ہونے پر حیران نہیں ہونا چاہیے اور یہ سفیدی ہمیشہ برقرار رہتی ہے کیونکہ یہ اس حصے کی عمر بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ صحت مند بالوں کے لیے وٹامن ای لازمی ہے مگر چینی اس وٹامن کے جذب ہونے کے عمل کو روک دیتا ہے۔

نمک: نمک کا استعمال جسم کے اندر پانی کے توازن کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، تاہم اس کی بہت زیادہ مقدار جزو بدن بنانا مختلف منفی اثرات کے ساتھ ساتھ بالوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، جن میں بالوں کی قبل از وقت سفیدی قابل ذکر ہے۔ 2300 ملی گرام نمک روزانہ سے زیادہ کھانا گردوں کے امراض اور ہائی بلڈ پریشر کا خطرہ بھی بڑھا سکتا ہے۔

سافٹ ڈرنکس: یہ مشروبات بھی قبل از وقت بالوں کی سفیدی کا باعث بنتے ہیں، یعنی ایسے مشروبات جو چینی، مصنوعی مٹھاس اور کلر سے بھرپور ہوتے ہیں، روزانہ کی مقدار میں ان کا استعمال یہ خطرہ بڑھا دیتا ہے جبکہ دانتوں کے امراض کا خطرہ بھی بڑھتا ہے۔

کاپر سے دوری: جسم میں کاپر کی کمی بھی بالوں کی قبل از وقت سفیدی کا باعث بنتی ہے، یہ جز مشروم، جھینگوں، کلیجی، دالوں، بادام، خشک خوبانی، ڈارک چاکلیٹ اور سورج مکھی کے بیجوں میں پایا جاتا ہے۔

□□□

(بحوالہ: www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ خواتین دنیا اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے کچھ عرصے سے یہ رسالہ میرے مطالعہ کا حصہ ہے۔ میرے مطالعاتی رسالوں میں اس رسالے نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ اس رسالے میں خواتین سے متعلق مضامین اور خواتین کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ رسالے کے مضامین دل کو چھو جانے والے اور معلوماتی ہوتے ہیں جو منتخب اشعار ہیں وہ ہمیشہ میرے پسندیدہ رہے ہیں۔ اس رسالہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس رسالہ کا مطالعہ نہ صرف وہ خواتین جو تعلیمی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں بلکہ وہ خواتین بھی کرتی ہیں جو اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا رہی ہیں کیونکہ مختلف النوع قسم کے موضوعات اس رسالے کی زینت بنتے ہیں ان میں شخصیات، انٹرویو، مضامین، افسانے، پکوان، صحت اور نگہداشت سے متعلق یعنی کہ میں اگر اختصار میں کہوں تو یہ رسالہ خواتین کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی و کامرانی کے لیے ہمیشہ دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر روبینہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تعلیم و تربیت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد۔

یہ ماہنامہ کسی خواتین دکن کے نام سے نہیں، نہ ہی کسی خواتین ہند کے نام سے...... بلکہ یہ تو ''خواتین دنیا'' کے نام سے چھپتا ہے، جو ہم قلمکار خواتین کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں...... دیدہ زیب سرورق کے ساتھ مکمل علمی و ادبی ماہنامہ ہے۔

خیر النساء علیم، آفیسرس میس فنکشن ہال گلی، ملک پیٹ، حیدر آباد

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' برابر مل رہا ہے۔ آپ لوگ خواتین کا مقام بلند کرنے میں لگی ہیں۔ خدا آپ کے ارادے میں کامیابی عطا فرمائے۔ اگست کے شمارے کے مشمولات پسند آئے۔ حضرت محل پر مضمون معلوماتی ہے۔

میرا ایک مضمون ''شکیلہ اختر کے افسانوں میں نسوانی کردار'' اپریل 2020 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کی پسندیدگی کے سلسلے میں بہت سے فون آئے جس سے خواتین دنیا کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔

شائقہ آفرین، پوسٹ میگھوان، وایا بینی پٹی، ضلع مدھوبنی (بہار)

'ماہنامہ خواتین دنیا' کا مارچ 2021 کا شمارہ پڑھا۔ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی کافی معلوماتی اور معیاری تھا۔ اس شمارے میں بہت سے ایسے مضامین تھے جن کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بہت سے کالم ایسے ہیں جو خاص طور سے خواتین کے لیے ہی ہیں۔ کہانیوں کا انتخاب بھی اعلیٰ اور معیاری ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ یہ رسالہ خواتین کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین میں بیداری پیدا کرنے میں بھی معاون ہے۔

عائشہ اسماعیل، مہندیان، میر درد روڈ، نئی دہلی

نئی دہلی میں نیشنل ایوارڈ سے اعزازی الکا

تعلیم جگت میں اور مندرجہ ذیل درجے کی کھیتیوں سے متعلق بیٹیوں کے لئے تحریک بینی الکا پتے کے گلوبل انڈیا بریزنس کے ذریعہ نیشنال کے موقع پر پروقار ہے۔ نئی دہلی میں تین اپریل کو قابل تقویت مندانہ تقویم میں گلوبل انڈیا برینیس فورم کا محافظ ڈا۔ یوگیش دوبی قدیم شدہ ضلعی صدر میاں کے قریب واقع آپ کی رہائش گاہ پر ہونے والے واقعات سے گفتگو ہوئی جس میں الکا پڈے نے بتایا تھا کہ ہر دن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی طرح کے جذبات سے منسلک نہیں ہوتے ہیں۔ کڑی میں جانت کا بدلاؤ مجھے اس کی کامیابی ملی۔ سائنس کی معاشرتی انتظامیہ کے ماتحت غریب افراد کی آن لائن تعلیم کی تعلیم کا کام کرنا ہے۔ کسی بھی مادھوی کی پڑھائی کے بارے میں خیال نہیں ہے۔ طالب علموں کی چھتوں کی پڑھائی تیز ہوتی ہے اور اس سے معاشرے کی مکمل حمایت ہوتی ہے۔ ہر ایک کی اقتصادی صورتحال حیرت انگیز ہے۔ اس طرح کے طلبا و طالبات کے چھتوں والے معاملے پر آن لائن پڑھتے رہتے ہیں۔ غریب خواتین کی تعلیم کے خاندان کے خاص طور پر توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح کا نتیجہ جاری رہتا ہے تین اپریل کو کانسٹیوشن کلب کا ہندوستان نئی دہلی میں قابل تقلید ہوگیا تھا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

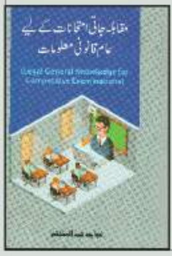

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

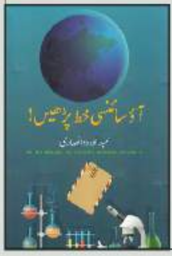

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

تاریخ وتہذیب وثقافت

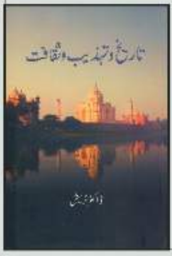

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

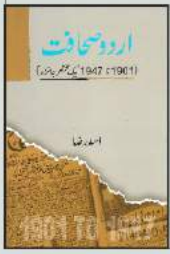

مصنف: اسد رضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

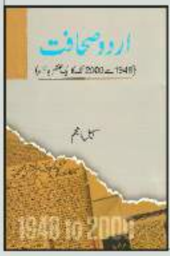

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly May 2021, Vol.5, Issue: 5

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026

ISSN 2581-4826

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے

مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025